بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
توحید کی پکار
www.KitaboSunnat.com
ماہر القادری
دار المسلم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

توحید کی پکار

مرتب

ماہر القادری رحمہ اللہ

دار المسلم، لاہور

نام کتاب : توحید کی پکار

مرتب : ماہر القادری رحمہ اللہ

ناشر : دارُالمُسلم، لاہور

کمپوزنگ : عزّام کمپوزنگ سنٹر، لاہور

قیمت : 50 روپے

B-153 خداداد کالونی، کراچی، فون: 7787137

فہرست

بدعت[1] توحید کی ضِد ہے

عامر عثمانی رحمہ اللہ (مدیر "تجلی")

توحید ایک سادہ سا لفظ ہے، جس کے مفہوم و مراد کو ہر عام و خاص جانتا ہے۔ لیکن اگر علم و عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہی سادہ سا لفظ اپنی حقیقت اور ثمرات و مقتضیات کے اعتبار سے تمام دُنیائے انسانیت کے لیے اتنا عظیم، ایسا اہم اور اس قدر گراں مایہ ہے کہ اسی پر اس کی دنیا اور عقبیٰ، آغاز اور انجام، حیات اور معاد، حتیٰ کہ تمدن و معاشرت کی اصلاح و فساد اور زندگی کے تمام شعبوں کی بھلائی و برائی کا دارومدار ہے۔ اگر علم و اعتقاد کا یہ سرچشمہ خشک ہو جائے تو انسان کے پاس خیر و فلاح اور ہدایت و حقیقت تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔ شاید اسی لیے اللہ رب العزت نے ازل کے دن اپنے بندوں سے سوال کیا تھا کہ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" اور بندوں نے کہا تھا کہ بلیٰ! "ہاں تو بیشک ہمارا رب ہے۔" یہ عہد حافظوں سے اگرچہ محو ہو گیا، لیکن انسان کے تحت الشعور اور فطرت میں ایک پیاس، ایک تحریک، ایک داعیہ بن کر سما گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں، ہر قوم اور ہر مذہب نے، کسی نہ کسی نوعیت سے توحید کی شان و عظمت کو تسلیم کیا اور عملاً بے شمار خداؤں کو پوجنے کے باوجود بنیادی اور نظری طور پر یہی مانا کہ بڑا معبود ایک ہی ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے معبود اسی کے قائم مقام ہیں، یا اس کی مختلف صفات کے نمائندے ہیں، یا انہیں امور عالم حصہ وار سپرد کر کے بڑا معبود آرام کر رہا ہے...... وغیر ذالک!

[یہ توحید کی شان و عظمت نہیں، بلکہ شرک ہے۔ فاضل صاحب مضمون کی یہ بات محل نظر ہے۔ ادارہ]

ممکن ہے بہت پرانے زمانہ میں بعض قومیں کسی قلیل مدت تک معبود کے تصور سے عاری رہی ہوں لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی انسانی شعور نے ذرا آنکھیں کھولیں اور فطرت کے تہ نشین داعیوں اور تقاضوں کو ابھرنے اور پر پرزے نکالنے کا موقع ملا، اسی وقت یہ قومیں آپ سے آپ بلا کسی خارجی تحریک کے انسان سے مافوق کسی طاقت کی تلاش میں سرگرداں نظر آئیں اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ہر فرد نے کسی اقتدار اعلیٰ اور قوی تر ہستی کا تصور قائم کر کے اس کی پرستش کے کچھ طریقے مقرر کر لیے!

---

[1] یہاں بدعت سے مُراد شرکیہ بدعت ہے —— ادارہ

تاریخ سے کتابی اور سطحی واقفیت رکھنے والے حضرات تو شاید میرے اس دعوے پر حیرت کریں۔ کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ پچھلے زمانوں میں تقریباً تمام ہی قومیں پتھر کے بتوں، گوشت پوست کے انسانوں اور سورج، دریا، آگ اور اسی طرح کی دیگر اشیاء کو معبود مانتی رہی ہیں۔ آج دور ترقی میں بھی مسلمانوں کے سوا کم وبیش ہر قابل ذکر قوم توحید کے برعکس عقائد رکھتی ہے اور عملاً متعدد خداؤں کی قائل ہے۔ لیکن جو لوگ تاریخ کا گہرا علم رکھتے ہیں اور ظاہری افعال کا علمی ونفسیاتی تجزیہ کر کے ان کے پیچھے کام کرنے والے عوامل ودواعیات کا پتہ چلانے کی اہلیت سے بہرہ ور ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ فطرت اور عقل کے بنیادی تقاضہ کے تحت تمام ہی قومیں اس حقیقت کو محسوس کرتی رہی ہیں کہ مالک الکل اور مقتدر اعلیٰ اور حاکم مطلق کسی ایک ہی ہستی کو ہونا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ عقل وعلم کی کجی، شعور ووجدان کی طفولیت اور آسمانی ہدایت وتنویر سے محرومی کے باعث وہ نہ تو اس فطری رجحان کو کسی واضح عقیدے کی شکل میں ظاہر کر سکیں نہ وہ یہ جان سکیں کہ صرف ایک معبود کو تسلیم کرنے کی صورت میں وہ کونسا طریقہ عبادت ہو سکتا ہے جو اس تسلیم اور خیال وعقیدے کی صحیح ترجمانی کر سکے۔ ان کی عقل اور علم کی حد تک ایک واحد مرکزی ہستی کے لیے جن صفات کا پایا جانا ضروری تھا، ان صفات کے لیے انہوں نے الگ الگ مظاہر اور نشانات مقرر کر لیے اور علیحدہ علیحدہ ان مظاہر اور نشانات کو پوجا۔ ہر مظہر اور نشان کو پوجتے ہوئے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی گمان کرتی رہیں کہ ہم اصل معبود کو پوج رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اگر کسی عقیدے اور تخیل کی ترجمانی کے لیے ایسے افعال واطوار اختیار کرے جو حقیقتاً اس عقیدہ وتخیل کی ضد اور نقیض ہوں تو یہ عقیدہ وتخیل دھندلا پڑتے پڑتے بالکل معدوم ہو جاتا ہے اور خواص کے قلب ودماغ میں اس کا موہوم سا نقش باقی بھی رہے تو کم سے کم عوام کے دل ودماغ میں یہ برائے نام بھی باقی نہیں رہتا۔ عوام اپنے اعمال میں عموماً رسم وروایت اور بے مغز تقلید واتباع کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ فطرت کے تقاضے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کے باوجود غلط اور باطل طرز عبادت نے توحید کے نقش کو اس طرح مٹا دیا کہ جب رسول نے ان سے کہا کہ "ایک ہی الٰہ کو مانو" تو اظہار حیرت کرتے ہوئے بولے کہ "یہ تو ہمارے سارے معبودوں کو ذلیل کر کے ایک ہی خدا کو سارے حقوق دیئے دیتا ہے۔" لیکن فی الحقیقت یہ حیرت اور اعراض توحید کے عقلی وجبلی انکار اور شعور کی تردید پر مبنی نہ تھا، بلکہ عملاً متعدد معبودوں کو پوجتے رہنے اور رسم ورواج کے رنگ میں رنگے جانے کا سطحی نتیجہ اور جہالت وبے شعوری کا ثمرہ تھا۔

آج کی دنیا کو دیکھئے! جو قومیں بے شمار بتوں کو پوجتی ہیں اور کتنے ہی انسانوں کو معبود بنائے ہوئے ہیں اور کتنے ہی خیالی دیوتاؤں کی پجاری ہیں، ان کے رہنماؤں اور عالموں سے آپ کلام کریں تو وہ ہرگز ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ کارخانہ عالم پر دو یا دو سے زیادہ برابر کی طاقت والے دیوتاؤں کی حکمرانی اور عمل داری ہے، بلکہ وہ اصل اور حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی آمر مطلق تسلیم کریں گے۔ لیکن چونکہ سب سے بڑا اللہ اور اس کی متعدد طاقتیں اور صفات آنکھوں سے نظر آنے والی چیز نہیں، اس لیے اس معبودِ حقیقی اور اس کی صفات پر اچھی طرح سے دھیان جمانے اور جس صفت سے مدد لینے کی ضرورت پڑے، اسی صفت پر اپنی توجہ مرتکز کرنے کے لیے ہم نے بتوں کو ظاہری نشان اور مظہر بنالیا ہے۔ بعض انسانوں اور خیالی دیوتاؤں کے بارے میں وہ یہ کہیں گے کہ بجائے خود بھگوان تو ہم کسی کو نہیں مانتے، البتہ فلاں بزرگ میں بھگوان نے اپنی فلاں صفت ڈال دی اور فلاں دیوتا کو فلاں طاقت سپرد کردی۔ گویا اصل کے اعتبار سے تو معبود ایک ہی ہے، مگر واسطے اور انتظامی آسانیوں کے اعتبار سے یہ لوگ دسیوں معبود بنائے ہوئے ہیں! (معاذ اللہ)

جو قومیں خوش فہمی سے اپنے کو عیسائی کہتی ہیں (''خوش فہمی'' اس لیے کہ درحقیقت نہ یہ اس تعلیم کو مانتی ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم تھی، نہ یہ تعلیم اپنی صحیح شکل میں آج موجود ہے) ان کا بھی یہی حال ہے کہ علمی و منطقی اعتبار سے قائل تو وہ تثلیث کی ہیں، لیکن کسی بھی عیسائی عالم سے گفتگو کیجئے! وہ شرک کا اقرار اور توحید کا انکار ہرگز نہیں کرے گا۔ بلکہ اپنی تثلیث کا سرا کھینچ تان کر توحید ہی سے ملائے گا اور باوجود مشرکانہ عقائد و اعمال کے بنیادی ذہن اس کا یہی ہوگا کہ مستقل بالذات مختار مطلق اور تمام اقتدار و قوت کا مرکز تو صرف ایک ہی ہستی ہوسکتی ہے!

ایسا کیوں ہے؟ انسان کی عقل و شعور اور فطرت کس لیے توحید کا میلان رکھتے ہیں؟ کھلی مشرک قومیں کس لیے توحید کا انکار نہیں کرتیں؟ ان سوالوں کا واحد جواب یہ ہے کہ اس کارخانۂ عالم کے لیے کسی ایک ہی ہستی کو خالق و مالک ماننا اور تمام قوت و قدرت کو اسی سے منسوب کرنا عین فطرت اور عین شعور اور عین عقل و فہم ہے۔ عقل چاہے کیسی ہی نکتہ سنجیاں کرلے، منطق چاہے کتنی ہی پلٹیاں کھالے، فلسفہ چاہے کیسے ہی گوشے نکال لے لیکن ناچار اس پہاڑ کی طرح اٹل حقیقت کو ماننا پڑتا ہے کہ معبود حقیقی اور تمام اختیار و اقتدار کا مالک اور پروردگار ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اسلام کے اپنی مکمل اور آخری شکل میں آنے سے پہلے تو یہ ممکن بھی تھا کہ خود ایجاد معبودوں کے پجاری اور خود تراشیدہ طرق عبادت کے متوالے توحید

سے برملا انکار کر دیں، لیکن اسلام نے آکر انسان کو اس کی فطری مانگ کا ٹھیک ٹھیک احساس دلایا۔ تہ نشین داعیہ کو ایک حسین وجمیل نظریہ اور اصول کی شکل میں پیش کیا۔ ٹھوس علمی و عقلی دلائل فراہم کیے۔ قرآن کی تنہا ایک ہی دلیل اتنی اثر انگیز، قوی اور آہن وفولاد سے زیادہ مستحکم ثابت ہوئی کہ انسانی عقل و علم اور مشاہدہ وتجربہ کے لیے اس کی تردید ناممکن ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے سادہ لفظوں میں کہا کہ ''اگر ایک سے زیادہ رب ہوتے تو کارخانہ عالم زیروزبر ہو جاتا۔'' یہ سادی سی مختصر دلیل انسانی عقل وعلم کی تمام بساط پر آسمان کی طرح چھا گئی۔ تجربہ نے قدم قدم پر بتایا کہ بقائے عالم کے لیے ایک ہی شہنشاہ اور مالک الملک کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ اسلام نے اور بھی مضبوط دلیلیں دنیا کے سامنے رکھیں اور دنیا کو ماننا پڑا کہ توحید کی صداقت وحقانیت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔

دوسرا جواب ایک اور بھی ہے جو اگرچہ عقلی وقیاسی قسم کا نہیں بلکہ اس کو سمجھنے اور ماننے کا مدار انسانی قلب وروح کی صالحیت پر ہے، لیکن چونکہ ہمارا خطاب اہل ایمان ہی سے ہے اس لیے اس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

سورۂ اعراف میں ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰی شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝﴾

(الاعراف ۷: آیت ۱۷۲)

''اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی اولادیں نکالیں اور خود انہی کو ان کا گواہ بنا دیا (تو ان سے پوچھا) ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' انہوں نے جواب دیا: ''بیشک!'' (یہ کام اللہ نے اس لیے کیا کہ) تم حشر کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس سے (یعنی تیرے رب ہونے سے) بے خبر تھے۔''

یہ واقعہ عالم مثال کا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روز اول سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام ہی انسانوں سے یہ عہد لیا گیا۔

[اس روایت کی تصدیق وتائید امام احمد رحمہ اللہ کی اس روایت سے ہوتی ہے جو مشکوٰۃ، باب الایمان بالقدر میں درج ہوئی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر یہی تشریح محقق معلوم ہوتی ہے اور اگلی تشریح کی کوئی دلیل مجھے معلوم نہ ہو سکی، سوائے اس کے کہ تمام انسانوں کو بہ یک وقت عالم مثال میں حاضر کر لینا عقول کے لیے حعذر رسا ہے، حالانکہ اس طرح کے معاملات میں عقل انسانی کی استعداد پر توجہ نہیں کرنی چاہیے ——— ع۔ح]

اور الفاظ قرآنی کو کسی خاص تعداد انسانی پر بھی بقول بعض محمول کیا جا سکتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں یہ بات محقق ہو جاتی ہے کہ توحید کا اعتراف واقرار فطرت انسانی کا جزو ہے۔ پہلی صورت میں تو کسی توجیہ کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر انسان اس میں شامل ہے، البتہ دوسری صورت میں یہ توجیہ کرنی پڑے گی کہ جس طرح بھوک، پیاس، نیند، عقل اور صورت نوعیہ وغیرہ انسان کے اندر ایک دوسرے میں متوارث ہوتی چلی جاتی ہیں، اسی طرح اس عہد الست کا اثر بھی قیامت تک متوارث ہوتا چلا جائے گا۔ یہ توجیہ محض تاویل کا درجہ نہیں رکھتی، بلکہ انسان کی تاریخ اس پر ناقابل تردید شہادت مہیا کرتی ہے۔ قدیم سے قدیم تر جس زمانہ کا حال ہمیں تاریخ بتاتی ہے، اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ غیر مہذب، پس ماندہ، بے علم اور ترقی سے ناواقف انسان بھی آپ سے آپ کسی نہ کسی معبود کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔ مانا کہ عقل کی نارسائی اور نفس کی فریب انگیزی کے باعث یہ پوجا توحید کی ضد اور شرک پر مشتمل تھی، لیکن اس حقیقت سے انکار کی کیا گنجائش ہے کہ ان کا جذبہ عبودیت فطرت ہی کی پکار تھا۔ فطرت نہ ابھارتی تو آخر کون سی طاقت انہیں مجبور کر رہی تھی کہ تلاش رزق، جستجوئے آرام و راحت اور دیگر مشاغل دنیاوی کے ساتھ ساتھ وہ خواہ مخواہ پوجا پاٹ میں وقت ضائع کریں اور بے وجہ خود کو کسی ایک یا چند معبودوں کے آگے پست و ذلیل بنائیں۔ آخر کس نے ان سے کہا تھا کہ سورج یا دریا یا پتھر کے مجسموں کو پوجنا شروع کر دو۔ ظاہر ہے کہ یہ محض اور محض اسی بناء پر ہو سکتا ہے کہ جس طرح بھوک، پیاس، طلب آرام، نیند اور جنسی میلان فطرت کے ایسے داعیئے ہیں کہ ان کے لیے کسی خارجی محرک اور معلم کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جذبۂ عبودیت اور خواہش نیاز مندی بھی فطرت ہی میں داخل ہے۔ جس کے لیے کسی بیرونی محرک و معلم کی احتیاج نہیں۔ احتیاج ہے تو صرف اس بات کی کہ اس جذبہ کو صحیح راہ پر ڈالنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم و تفہیم کو قبول کیا جائے۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد وہ اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے جو کم فہم اور سطح بیں لوگ عہد الست کے بارے میں کرتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ کہتے ہیں کہ جب یہ ازلی عہد انسان کے حافظہ میں محفوظ نہ رہا تو اس سے کیا حاصل ہوا؟ اور کیوں اللہ نے یہ عبث کام کیا؟ (معاذ اللہ)

یہ اعتراض اس لیے ختم ہو جاتا ہے کہ یہ عہد حافظوں میں مرتسم کرنے کے لیے لیا ہی نہیں گیا تھا نہ اللہ تعالیٰ نے توارث و تناسل میں یہ قاعدہ رکھا ہے کہ جو واقعات باپ کے حافظہ میں محفوظ ہوں وہ کل یا بعض اولاد کے حافظوں میں بھی منتقل ہو جائیں! بلکہ اس عہد کا منشاء توحید اور جذبۂ پرستش کو انسان کی فطرت کا

جزو بنا دیتا تھا اور اس کے اندر پروردگار کی تلاش وتجسس کا رجحان، استعداد اور داعیہ پیدا کر دیتا تھا۔ کسی واقعہ کا حافظہ سے محو ہو جانا ہی اس کی بے اثری پر کافی دلیل نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو جوانی میں یہ بالکل یاد نہیں رہتا کہ آج ہم جس زبان کی ہر کتاب کو فر فر پڑھ ڈالتے ہیں، اس زبان کی الف بے ہمیں بچپن میں کس نے، کب اور کس طرح سکھائی؟ انہیں نہ وہ ماحول یاد ہوتا ہے، جس میں انہیں حرف شناسی کے ابتدائی سبق ملے نہ اس سے متعلق کوئی اور تفصیل حافظہ میں محفوظ ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کی موجودہ حرف شناسی اور زبان دانی اور علم وفن کی بنیاد اولین چھٹپنے کی یہی تعلیم تھی اور اسی تعلیم نے ان میں یہ ملکہ پیدا کیا کہ ضخیم کتابیں بلا تکلف پڑھ ڈالیں۔ اب کیا کوئی نادان یہ احمقانہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ حافظہ سے محو شدہ ابتدائی تعلیم بیکار اور عبث رہی، یا کوئی پڑھا لکھا آدمی محض اس لیے اپنے پڑھے لکھے ہونے سے انکار کر سکتا ہے کہ اسے اپنے بچپن کے معلم کا نام اور حرف شناسی کا زمانہ اور کیفیت اور ماحول اور کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ یاد رہے یا نہ رہے لیکن حرف شناسی کا جو ملکہ اور شعور پیدا ہو چکا ہے وہ بالکل کافی ہے۔

اسی سے کسی نہ کسی حد تک ملتی جلتی ہوئی مثال عہد الست کی ہے۔ وہ حافظوں میں ثبت کرنے کے لیے نہیں لیا گیا تھا بلکہ وہ اس لیے تھا کہ انسان کی جبلت وفطرت میں ایک ملکہ، ایک استعداد اور ایک مستقل پیاس، ایک طلب، ایک داعیہ، ایک تحریک ہمیشہ کے لیے جاگزیں کر دے اور دیگر عناصر فطرت اور اجزائے جبلت کی طرح یہ بھی قیامت تک فطرت کا جزو بنا رہے۔

اس کو اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے:۔

﴿......فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ......الخ﴾ (الروم ۳۰: آیت ۳۰)

''اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اس کی تخلیق میں تغیر وتبدل ممکن نہیں۔''

نبی ﷺ نے اسی حقیقت کو بایں الفاظ بیان فرمایا:

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی (وغیرہ) بنا دیتے ہیں۔'' (صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث ۱۳۸۵)

اصل فطرت یہی ہے کہ انسان ایک معبود کو مانے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ عقل وعلم کی نارسائی کے باعث انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ماننے کے صحیح طریقے اور آداب اور مقتضیات کو آپ سے آپ سمجھ

سکے۔اس کے لیے اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اس ضرورت کو اللہ تعالیٰ برابر پورا کرتا رہا اور آخر کار ایک آخری نبی ﷺ کو مکمل شریعت اور دین دے کر بھیج دیا تا کہ قیامت تک کے لیے تمام عالم انسانی اس دین کے بتائے ہوئے طریقوں پر چل کر بندگی کا صحیح حق ادا کر سکے۔

توحید خالص:

ان تمہیدی سطور کے بعد اب ہمیں دیکھنا ہے کہ جب تمام قومیں کسی نہ کسی نوعیت میں توحید کی صداقت وحقانیت کی صراحتاً یا اشارۃً قائل ہیں تو کیا ان کی اور مسلمانوں کی توحید ایک ہی ہے یا الگ الگ؟ کیا توحید کی حد تک سب کو ایک ہی صف میں سمجھا جائے گا یا کچھ فرق کیا جائے گا؟

تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ توحید اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو فرق واختلاف اور تقسیم کی گنجائش ہی نہیں رکھتی، لیکن لفظی مفہوم کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تو ان دو قسموں کا نام توحید ربوبیت اور توحید الوہیت رکھا ہے لیکن میں بات کو زیادہ عام فہم بنانے کے لیے ان کا نام توحید لفظی اور توحید حقیقی رکھتا ہوں۔

توحید لفظی تو یہ ہے کہ آدمی معبود ایک ہی مانے اور بس۔ یعنی وہ یوں کہے کہ تمام اقتدار وقوت کا مالک ایک ہی ہے اور اس کے مثل اور برابر کوئی نہیں۔ بس بات اتنے پر ختم کر دے یا زیادہ سے زیادہ یہ مان لے کہ وہی رزق دینے والا ہے، مارنے والا ہے، جلانے والا ہے۔ اس طرح کی چند صفات مان کر خاموش ہو جائے اور نہ تو جملہ صفات الٰہیہ کا اقرار کرے نہ ان مقتضیات اور ثمرات پر توجہ دے جو اللہ تعالیٰ کو مالک وخالق اور رزاق ورب ماننے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ یہ ہے توحید لفظی۔ یہی توحید ہے جس کے غیر مسلم بھی قائل ہیں اور یہی وہ توحید ہے جو اگر چہ لفظاً توحید کہی جاتی ہے لیکن نتائج اور ثمرات کے اعتبار سے کفر وشرک پر منتہی ہوتی ہے اور اس توحید کے قائلین عموماً وہ کچھ کرتے اور کہتے ہیں جو توحید حقیقی واصلی کے فوائد ومنافع کو پامال کرنے والا اور شرک وکفر کے مضرات وفسادات کو نشو ونما دینے والا ہوتا ہے!

قرآن وحدیث میں لفظی توحید کی پوری صراحت موجود ہے اور بہت صفائی سے بتا دیا گیا ہے کہ اس طرح کی توحید نہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے نہ اس سے توحید حقیقی کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ توحید لفظی کے قائلین کا حال اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ یوں بیان کیا:

﴿قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهَآ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ۝ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ

قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ○﴾ (المؤمنون ۲۳: آیت ۸۴تا۸۹)

''(اے محمد ﷺ!) اگر تم ان سے پوچھو کہ بتاؤ زمین و آسمان اور ساری چیزیں کس کی ہیں اگر تمہیں معلوم ہو؟ تو کہیں گے کہ اللہ کی! تو ان سے کہو کہ تم پر نصیحت کیوں کارگر نہیں ہوتی! پوچھو: ''سات آسمانوں اور عرش اعظم کا مالک کون ہے؟'' کہیں گے کہ اللہ! کہہ دو کہ پھر تم کس لیے نہیں ڈرتے۔ پوچھو: تمام کائنات کی ملکیت و حکومت کس کے دست قدرت میں ہے؟ وہ کون ہے جو دوسروں کو پناہ دیتا ہے لیکن اس کے بالمقابل کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ کہیں گے کہ اللہ! تو کہہ دو کہ پھر آخر تم پر کیا جادو چل گیا ہے (کہ تم گمراہ ہوئے جاتے ہو)!''

دوسری جگہ فرمایا: •

﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ...... الخ﴾

(لقمان ۳۱: آیت ۲۵)

''اگر ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ تو یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے۔''

یعنی وہ لوگ اللہ کی مالکیت اور حاکمیت اور خالقیت وغیرہ کے تو قائل تھے لیکن پھر بھی وہ راہ راست سے اس درجہ ہٹے ہوئے تھے کہ جیسے وہ سحر زدہ ہوں، جو صاف اور سیدھی راہ پر چلنے کی بجائے غلط اور ٹیڑھی راہ پر چلے جا رہے ہوں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ○﴾ (یوسف ۱۲: آیت ۱۰۶)

''ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود اکثر لوگ مشرک ہوتے ہیں۔''

دوسری قسم توحید حقیقی ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو بایں معنیٰ ایک مانے کہ تمام صفات کمالیہ کا وہی متصف ہے اور اسی کی عمل داری نہ صرف مادی کائنات کے ہر گوشے پر ہے بلکہ انسان کے جذبات و خیالات، روح، شعور اور لطیف سے لطیف تر عناصر پر ہے اور اس کے اقتدار مطلق اور حاکمیت جامعہ کے جو بھی تقاضے اور مطالبے ہیں وہ سب کے سب نہ صرف دل و زبان سے واجب القبول ہیں بلکہ انہیں عملی زندگی میں رہنما بنانا اور افعال و اعمال سے ان پر یقین کامل کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے۔ وہی ہر چھوٹے بڑے معاملہ کا منصف، ہر مسئلہ کا حل کرنے والا، ہر کھلی چھپی بات سے باخبر، ہر عیب و صواب کا واقف کامل اور ہر مقام پر ہر وقت ہر زمانے میں حکمران ہے!

توحید کی یہی قسم ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے اور اسی کے ماننے والے اس کے نزدیک مومن ہیں، جیسا کہ قرآن وحدیث میں اسے بالوضاحت بیان کر دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن وحدیث میں ایسی لفظی تقسیم نہیں ملتی جیسی ہم نے یا بعض علمائے سلف نے کی ہے، کیونکہ توحید تو فی الاصل ایک ہی ہے اور جس ناکمل، ناقص اور بے نتیجہ تخیل کو گمراہ انسانوں نے توحید کا نام دے لیا ہے، وہ توحید نہیں بلکہ شرک ہے۔ لیکن ہم نے یہ تقسیم محض سمجھانے اور بات کو واضح کرنے کے لیے کی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کو جو توحید مطلوب ہے اس کی وضاحت ہو اور جو توحید مطلوب نہیں اس کی تردید ہو جائے۔

توحید حقیقی کی وضاحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بہت سی صریح و واضح آیات نازل فرمائیں اور سرور کونین ﷺ نے ان آیات کی تشریح وتوضیح اتنے تکرار اور کثرت سے کی کہ شاید ہی کسی اور آیت کی کی ہو۔ آپ ﷺ نے شرک جلی ہی کو واضح نہیں فرمایا بلکہ شرک خفی کو بھی موقع بہ موقع بیان کرتے رہے اور زندگی کے کسی بھی گوشہ میں مشرکانہ خیالات وعقائد کی گنجائش نہیں چھوڑی، یہاں تک کہ فرمایا:

''چاہیے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی ہر حاجت اللہ تعالیٰ ہی سے مانگے، یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی جب وہ ٹوٹ جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر میسر نہ فرمائے تو جوتے کا ایک تسمہ بھی میسر نہیں آ سکتا۔''

(ترمذی بحوالہ مشکوۃ المصابیح، کتاب الدعوات، حدیث ۲۲۵۱، حسن، الالبانی)

غور کیجیے! کتنی پاکیزہ اور بے میل توحید کا سبق رسول اللہ ﷺ دے رہے ہیں۔ انہوں نے امت کو ایک حقیر سی شئے یعنی جوتے کے تسمہ کی مثال دے کر یہ تعلیم دی کہ خزانے، جائدادیں اور مہتم بالشان چیزیں ہی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نہیں ہیں بلکہ دنیا کی حقیر سے حقیر تر چیز بھی اسی کی مرضی سے میسر آ سکتی ہے۔ ورنہ اس کی مرضی نہ ہو تو جوتے کا تسمہ جیسی حقیر چیز بھی میسر نہیں آ سکتی۔ اس کی ہزاروں مثالیں آپ کو اپنے چاروں طرف بکھری نظر آ سکتی ہیں۔ ایک شخص ہے جو دونوں وقت قیمتی اور لذیذ غذائیں کھاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں گیہوں کی ایک روٹی کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ لیکن دوسرا شخص ہے جو گیہوں کی ایک روٹی ہی کے لیے خون پسینہ ایک کرتا ہے اور پھر بھی بعض اوقات اسے بھوکا سو جانا پڑتا ہے۔ آدمی غور کرے تو اللہ تعالیٰ کے انعامات اور جود وسخا کی انتہا نہیں۔ کبھی جس کو نمونیہ ہوا سے پوچھے کہ ایک سانس لینے میں وہ کس درجہ اذیت برداشت کرتا ہے اور ہوا کی ایک معمولی سی مقدار کو اپنے پھیپھڑوں تک پہنچانے کے لیے اسے کتنی عظیم تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ حالانکہ یہی وہ ہوا ہے جسے تمام

انسان بلا ادنیٰ مشقت کے ہر لحظہ اپنی زندگی کے کام میں لاتے ہیں، اور محسوس بھی نہیں کرتے کہ ان کا ہر سانس اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عطا اور انعام ہے۔ وہ جب چاہے اسی سانس کو انسان پر بارِ عظیم بنا سکتا ہے۔ لہٰذا انصاف اور علم و عقل کا تقاضا یہ ہے کہ بڑی سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی چیز تک اسی کے تصرف واختیار میں ہو اور اس کے حصول میں دنیاوی ذرائع اور اسباب محض بہانے کا درجہ رکھتے ہیں، اصلی معطی اور بخشندہ وہی مالک الملک ذوالجلال والاکرام ہے۔

توحید کی نزاکت رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے واضح ہوتی ہے:

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔''

(مسند احمد بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق، حدیث ۵۳۳۱، صحیح)

جانتے ہیں آپ کہ یہ کس کے الفاظ ہیں؟ اس صادق و مصدوق کے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾[1] فرمایا۔ جس کا ہر فرمودہ ریب و شک سے بالاتر اور عین صداقت ہے۔ غور کیجیے! فکر و نظر کی کن گہرائیوں تک توحید کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اور کس آخری درجہ تک اجتناب عن الشرک مطلوب ہے۔ براہ راست کسی مخلوق کو صفات الٰہیہ میں سے کسی صفت کے ساتھ متصف کرنا تو درکنار صرف اتنی سی بات بھی شرک قرار دی گئی کہ آدمی عبادت کرتے ہوئے دکھاوے کی نیت رکھے۔ گویا وہ اپنی عبادت کا صلہ مقبولیت و شہرت اور عقیدت و نیازمندی کی شکل میں مخلوق سے طلب کر رہا ہے۔ حالانکہ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا، مگر دل میں دکھاوے کا خیال پایا جانا ہی حکم شرک کے لیے کافی سمجھا گیا اور کیوں نہ سمجھا جاتا جب کہ اللہ تعالیٰ نے شروع ہی میں یہ تعلیم بندوں کو پہنچائی کہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾[2] ''تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔'' حصر جلی و صریح پر مشتمل یہ الفاظ یقیناً اس کے طالب تھے کہ شرک کے شائبہ تک کو مٹا دیا جائے اور توحید خالص و حقیقی کی بنیاد پر امت اسلامیہ کی تعمیر ہو۔ عربی میں عبد غلام کے معنیٰ میں آتا ہے اور امۃ لونڈی کے معنیٰ میں۔ یہ دونوں لفظ اسلام سے پہلے اور اس کی آمد پر اہل عرب میں عموماً مستعمل تھے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

---

[1] النجم ۵۳: آیت ۳ و ۴ —— (ترجمہ) ''وہ (یعنی نبی ﷺ) اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہوتی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔'' [2] الفاتحہ ۱: آیت ۴ —— (ترجمہ) ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔''

''تم میں سے کوئی بھی ہرگز کسی کو عبدی اور امتی نہ کہے کیونکہ تم سب اللہ کے (بندے) ہو اور سب عورتیں اللہ کی باندیاں ہیں۔ ہاں تمہیں کہنا چاہیے کہ غلامی (میرا غلام) اور جاریتی (میری کنیز) اور جوان مرد اور جوان عورت۔'' (صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات)

ظاہر ہے کہ اپنے معروف معنٰی کی وجہ سے کوئی بھی عرب عبدی اور امتی اس معنٰی میں نہیں بولتا تھا جس معنٰی میں انسان کو اللہ کا عبد اور امۃ کہا جاتا ہے۔ لیکن قربان جائیے اس شان توحید اور تنزیہہ مکمل پر کہ لفظی تشابہ بھی پسند نہیں فرمایا اور فساد و تخریب کی جڑیں کاٹ دیں۔

توحید خالص کے اثبات اور شرک کے بطلان پر قرآن و حدیث سے صدہا دلیلیں لائی جا سکتی ہیں، لیکن چونکہ ہمارا روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو توحید کے قائل اور شرک کو برا سمجھنے والے ہیں اس لیے اور کچھ کہنے کی بجائے ایک حدیث پر کلام کے بعد اس پہلو کو ختم کرتے ہیں۔ یہ حدیث ابن حبان اور حاکم اور ترمذی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ اس سے ہر مسلمان اندازہ کر سکتا ہے کہ اسلام کو صرف اتنا ہی مطلوب نہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کو ایک اور خالق و مالک اور رازق و رب مان کر امور دنیا میں غرق ہو جائیں بلکہ وہاں تو اس کی تمام صفات کاملہ کا اعتراف و ایقان مطلوب ہے، تاکہ آپ کو زندگی کے کسی بھی گوشہ سے اس کے اقتدار و تصرف کو خارج کر دینے کی گنجائش نہ ملے اور کسی بھی عنوان سے آپ اس کے سوا کسی کو بااختیار و حکمران تصور نہ فرما سکیں:

کائنات میں جو بھی اسباب و نتائج اور وسائل و ثمرات نظر آتے ہیں ان سب میں اللہ ہی کی کارسازی اور قدرت کارفرما ہے۔ یہ نہیں کہ وہ مالک الملک کائنات کو تخلیق کر کے ایک طرف ہو گیا اور مخلوق کو من مانی کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا نہ یہ کہ رزق، حیات و موت اور اسی نہج کے چند مہتم بالشان امور تو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھے، باقی جملہ قوتیں مخلوق میں تقسیم کر دیں۔ بلکہ وہ ہر زمانہ اور ہر مقام پر انسان کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں، رنج و راحت میں، کامیابی و خسران میں، ذلت و عزت میں، غربت و امارت میں پوری طرح متصرف اور کارپرداز ہے۔

بدعت:

توحید کی ضد اگرچہ شرک ہے لیکن انسان کی عقل اور علم کو اتنی رسائی نہیں کہ وہ نبی صادق ﷺ کی توضیح و تنبیہ کے بغیر پوری طرح یہ سمجھ سکے کہ کون سے امور ہیں جو شرک کے تحت آتے ہیں اور کون سے معتقدات باوجود مشرکانہ نظر نہ آنے کے فی الحقیقت مشرکانہ ہوتے ہیں۔ ''ریا'' ہی کو دیکھ لیجئے! یہ اپنی

ظاہری شکل میں زیادہ سے زیادہ ایک ناقص اور عیب دار فعل نظر آتا ہے، جس کا مرتکب اکثر حالات میں انکار توحید کا وہم بھی نہیں کرتا اور یہ تصور تک نہیں کرتا کہ وہ شرک کی غلاظت سے آلودہ ہو رہا ہے لیکن زبان صادق ومصدوق ﷺ نے اسے متعدد بار شرک سے تعبیر فرمایا۔

یہی معاملہ بِدعت کا بھی ہے۔ بدعت کسے کہتے ہیں؟ پہلے اسے سمجھ لیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر ﷺ کے ذریعہ سے انسان کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات اور نظام زندگی نازل فرمایا اور زندگی کی کارفرمائی کے لیے جتنے گوشے ممکن ہیں ان سب کے لیے کچھ اصول، کچھ طریقے اور کچھ قوانین مقرر فرما کر اعلان کر دیا کہ ﴿......اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ......الخ﴾ (المائدہ ۵: آیت ۳)

''آج ہم نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا۔'' گویا مملکت عالم کے لیے جس دستور جاودانی کی ضرورت تھی اسے تمام وکمال اللہ رب العزت نے انسان کو عطا کر دیا اور اس کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ قیامت تک اس پر کوئی اضافہ یا اس میں کچھ کمی کی جا سکے! رسول اللہ ﷺ نے بالفاظ صریح بار بار اس کی تصدیق کی:

''جس شخص نے ہمارے اس امر میں (اور ایک روایت میں ''فی دیننا'' یعنی ہمارے دین میں کے الفاظ ہیں) کوئی نئی چیز (یعنی بدعت) نکالی وہ ناقابل قبول ہے!''

(صحیح بخاری، کتاب الصلح، حدیث ۲۶۹۸۔ صحیح مسلم، کتاب الاقضیہ، حدیث ۱۷۱۸)

دوسری جگہ فرمایا:

''خبردار! بِدعت سے بچتے رہنا۔ یقیناً ہر بدعت گمراہی ہے!'' (صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، حدیث ۸۶۷)

ایک اور جگہ بتایا کہ ''دین میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے انتہائی غضب کا مستحق ہوگا۔'' ایک اور جگہ بتایا کہ جب کسی جگہ ایک بدعت اختیار کی جاتی ہے تو اس کے عوض میں وہاں سے ایک سُنّت اللہ تعالیٰ اٹھا لیتا ہے۔ یعنی دوہری محرومی، ایک تو بدعت کا گناہ اور دوسرے سنت کی برکت سے محرومی!

کسی کو اختیار نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی نئی عبادت، کوئی جدید طریق پرستش، کوئی خود ایجاد اصل وفرع دین میں بڑھا سکے۔ صرف اتنا اختیار دیا گیا ہے کہ جن امور ومسائل کے لیے وضاحت وصراحت کے ساتھ کھلے احکام بیان نہیں کیے گئے ان میں دین کے دیگر اصول واحکام کی روشنی میں اجتہاد، غور وفکر اور استنباط کرو۔ احکام کے اسباب وعلل پر نظر رکھو۔ قیاس صحیحہ سے کام لو اور جو عبادات ووظائف کسی

خاص شکل میں متعین کردیئے گئے ہیں ان میں ہرگز تبدیلی مت کرو۔ چنانچہ اجتہاد واستنباط کی مثال تو وہ فقہ ہے جو امت کے علماء وماہرین نے قرآن وحدیث کی روشنی میں مدون کی اور عبادات ووظائف کی مثال نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ ہیں کہ ان کے لیے جو تعداد، جو تفصیل، جو اوقات، جو شرح مقرر کردی گئی ہے اس میں تبدیلی کی سرمو گنجائش نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ فجر میں دو کی بجائے چار یا ظہر میں چار کی جگہ چھ فرائض پڑھے جائیں۔ روزہ کو مغرب کی بجائے عشاء کے وقت افطار کیا جائے۔ حج میں افعال کی ترتیب وکیفیت بدل دی جائے یا زکوۃ کی شرح میں من مانے تغیر کردیئے جائیں۔ اب رہے وہ امور جو بجائے خود ممنوع ومکروہ نہ ہوں مگر انہیں قرون مبارکہ میں اختیار نہ کیا گیا ہو، تو کسی خاص سبب اور تقاضے کے پیش آجانے پر ان میں بطور ذریعہ ووسیلہ اختیار تو کیا جاسکتا ہے لیکن انہیں عبادت مستقلہ کی شکل دینا اور ان پر اصرار وشدت جائز نہیں!

[یہ اجتہادی معاملات کی بات ہو رہی ہے — ادارہ]

بدعت کی حقیقت کو سمجھنے میں سطحی فہم رکھنے والوں کو ایک اور دشواری پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ اگر ہرنئی بات بدعت ہے تو بے شمار امور ایسے ہیں جو نبی ﷺ کے دور مبارک میں نہیں تھے، نہ قرآن وحدیث میں ان کی وضاحت ہے۔ لیکن بعد کے مسلمان انہیں اختیار کیے ہوئے ہیں اور تمام علماء اسلام ان کی حلت بلکہ ضرورت واہمیت پر متفق ہیں۔ مثلاً دینی کتابیں لکھ کر چھاپنا اور فروخت کرنا، مدرسے بنا کر ان میں مہتمم اور تنخواہ دار مبلغین رکھنا، دفاتر کھولنا، وغیرہ ذالک!

یہ اشتباہ فی الحقیقت دین اور احکام اسلامیہ کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ ایسا دستور کوئی ہو ہی نہیں سکتا جس میں تمام ممکن جزئیات بیان کردی گئی ہوں۔ دستور تو اصول وکلیات سے بحث کرتا ہے اور مطلوب وغیر مطلوب افعال وعقائد کی تشریح بیان کردیتا ہے۔ اب یہ عوام الناس کا کام ہے کہ اپنے افعال وعقائد کو اس کی روشنی میں جانچیں اور ان مقاصد کو پورا کریں جن کا دستور طالب ہے۔ قرآن وحدیث نے علم کی اشاعت کا حکم جاری کیا۔ اب یہ انسانوں کا کام ہے کہ ہر دور کے وسائل وذرائع کے مطابق اس حکم کی تعمیل کریں اور بہتر سے بہتر انتظام کے ذریعہ سے مقصد اشاعت کو پورا کیے جائیں۔ کتابیں چھاپنا تو ایک طرف اگر ہم ریڈیو یا کسی اور ایجاد کو اس مقصد کا ذریعہ بنائیں گے تب بھی کوئی خرابی واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ ان وسائل واسباب کی حیثیت نہ ایجاد فی الدین کی ہے نہ بجائے خود یہ عبادت ہیں، بلکہ ان کو اختیار کرنا ایک نیک مقصد کے حصول کی خاطر ہے۔ جس کی پاکیزگی وخوبی قرآن وحدیث نے صراحۃ

بیان کی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''دوسروں تک تبلیغ پہنچاؤ خواہ ایک آیت ہی ہو۔'' اب ایک شخص کو اختیار ہے کہ لوگوں کو حدیث سنانے اونٹ پر بیٹھ کر جائے یا ریل پر، فرش پر بیٹھ کر سنائے یا تخت پر۔ کوئی بھی ایسا طریقہ جس میں دین کے کسی اور حکم کی نافرمانی نہ ہوتی ہو اس کے لیے جائز ہوگا اور بدعت نہ کہلائے گا۔

ان تمہیدی سطور کے بعد اب سمجھئے کہ بدعت، توحید کی ضد کیسے ہے؟ دین کے بارے میں جب ہم نے یہ مان لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک مکمل دستور ہے اور کائنات کا خالق و مالک اور مختار کل ہونے کے باعث اللہ تعالیٰ ہی اس کا مستحق بھی ہے کہ دستور بنائے اور حدود مقرر کرے تو یہ بات آپ سے آپ طے ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو قانون کی ایک بھی نئی دفعہ تراشنے کا اختیار نہیں رہا، اور جو شخص ایسا کرے گا وہ گویا خود کو بھی کسی نہ کسی درجہ میں اُلوہی قوت واقتدار کا شریک سمجھے گا۔ اسی کا نام شرک ہے!

دوسرے پہلو سے یہ شرک کفر تک بھی پہنچتا ہے اور وہ یوں کہ دین میں دو ہی طرح کی چیزیں ہیں۔ ایک تو وہ جو اللہ تعالیٰ سے قربت حاصل کرنے اور اس کی رضا اور انعام پانے کا ذریعہ ہیں۔ دوسری وہ جو اس سے دور ہونے اور اس کا قہر وعتاب حاصل کرنے کا سبب ہیں۔ انسان کے پاس تو ایسی عقل وبصیرت تھی نہیں کہ وہ ہزار پردے میں نہاں ذوالجلال والاکرام کی مرضیات کو از خود پا سکتا۔ وہ ہرگز نہیں جان سکتا تھا کہ رب اکبر کن اعمال وعقائد اور کن طریقوں سے خوش یا ناراض ہو سکتا ہے اور کن افعال پر انعام اور کن افعال پر عذاب دے سکتا ہے؟ اس علم وخبر کا واحد ذریعہ وحی دین ہے جسے اللہ رب العزت نے اپنے نبی صادق ﷺ کے ذریعہ سے انسانوں تک پہنچایا۔ اس دین میں وہ تمام طریقے اور اصول کھول کر بیان کر دیئے گئے جن سے اللہ تعالیٰ خوش یا ناراض ہوتا ہے۔ کوئی کسر اس میں نہیں چھوڑی گئی۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کام میں کسر کا کیا امکان! تب کوئی شخص اگر بالکل نیا کام نکالتا ہے جس کے لیے دین میں کوئی حکم نہیں دیا گیا اور سمجھتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا تقرب اور ثواب آخرت حاصل ہوگا تو گویا وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین ناقص ہے۔ جس میں حصول تقرب کا یہ طریقہ بیان نہیں کیا گیا۔ (العیاذ باللہ) نیز وہ یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ نعوذ باللہ! خود اللہ تعالیٰ کو وہ طریقے معلوم نہ تھے جو اسے خوش کرنے کے ہو سکتے ہیں۔ جبھی تو اس نے میرے اس نو ایجاد طریقہ کو بیان نہیں کیا۔ وہ اس کا بھی مدعی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا آخری اور سب سے افضل رسول ﷺ بھی حصول تقرب اور وصول ثواب کا وہ طریقہ نہیں پا سکا جسے میں نے پالیا ہے، ونعوذ باللہ من ذالک!

حق یہ ہے کہ اعمال خیر سے ثواب کا حاصل ہونا کوئی حسابی یا سائنسی فارمولا نہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ جس طرح دو اور دو لازماً چار ہوں گے یا جس طرح پانی آنچ پا کر لازماً بھاپ بن جائے گا، اسی طرح انسان عمل خیر کر کے لازماً ثواب حاصل کر لے گا۔ بلکہ قرآن وحدیث اس پر شاہد اور اصحاب واتقیاء کا قول وعمل اس کا گواہ ہے کہ اعمال خیر تو صرف تعمیل حکم الٰہی کے درجہ میں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کی حیثیت ان الطاف کے شکریہ کی سی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان پر بطور احسان کر رکھے ہیں۔ جن اخروی انعامات کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اعمال خیر پر فرمایا ہے، وہ انسان کو تبھی ملیں گے جب اس کے اعمال خیر اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول بھی ہو جائیں۔ نہ مقبول ہوں تو ہزار سال کی عبادتیں بھی بے کار اور فضول ہیں!

اب غور یہ کرنا چاہیے کہ کون سا طریقہ ہے جسے اختیار کر کے یہ امید ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال مقبول فرمالے گا۔ واحد جواب یہی ملے گا کہ خود کو سراپا بندۂ حکم بنالینا اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقوں کو مضبوطی سے پکڑنا اور اس کے فرامین کو بغیر کمی بیشی کے قولاً اور عملاً تسلیم کر لینا مقبولیت کی امید دلا سکتا ہے۔ اپنا کوئی نیا طرز عبادت نکال کر یہ ثابت کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی عبادتیں کافی نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کو بھڑکانے کا باعث ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ غلو فی الدین خواہ وہ دین میں افراط کے ذریعہ سے ہو یا تفریط کے ذریعہ سے بے حد ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے!

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ...... الخ﴾ (النساء۴: آیت ۱۷۱)

''اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو مت کرو۔''

رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا:

''اپنی طرف سے دین میں سختی کرنے یعنی حد سے بڑھنے اور غلو کرنے والے ہلاک ہوئے۔''

(صحیح مسلم، کتاب العلم، حدیث ۶۷۸۴)

بدعت خواہ اس معنیٰ میں ہو کہ حصول ثواب کے نئے طریقے ایجاد کیے جائیں جنہیں نہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے بتایا نہ اصحاب رسول رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا، یا اس معنیٰ میں ہو کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے اعمال واعتقاد کی جو حدیں اور صورتیں متعین کر دی ہیں ان میں آدمی خواہ مخواہ باریکیاں اور نکتے نکالے، یا جن احکام، اشیاء اور بندگان ذی مرتبہ کے جو مراتب، جو اقدار اور جو درجات متعین فرما دیئے ہیں ان میں اضافے کرتا چلا جائے، دونوں ہی صورتیں بربادی وخسران کی ہیں!

اب میں آگے بڑھنے سے پہلے ناظرین کی خدمت میں چند معروضات پیش کروں گا۔ اگر آپ بعض ایسے اعمال وعقائد کے حامل ہیں جو میرے سابقہ اور آنے والے بیان کی روشنی میں بدعت ٹھہرتے ہیں تو آپ مکدر اور ناراض نہ ہوں بلکہ انصاف کے ساتھ یہ غور فرمائیں کہ دین نہ میری جائداد ہے نہ آپ کی۔ دین میں کسی اضافے یا کمی کا نہ مجھے اختیار ہے نہ آپ کو۔ صرف یہ دیکھیے کہ دین تو قرآن وسنت کا نام ہے اور قرآن وسنت سے علم وعقل کی روشنی میں جو احکام واصول نکلتے ہیں وہی ایک مسلمان کے لیے واجب القبول ہیں، اور جو طریقے اور رسمیں رائج ہیں وہ جس حد تک قرآن وسنت کے خلاف ہوں اسی حد تک ترک واحتراز کے لائق ہیں۔ محض یہ بات کہ بعض طریقے نہ صرف عوام بلکہ بعض خواص میں بھی رائج ومتبول ہو گئے ہیں اور ان کی ابتداء کرنے والوں میں بعض بڑے بڑے نیک عمل لوگ شامل ہیں، اس بات کے لیے کافی نہیں کہ اسے دین سمجھ لیا جائے، بلکہ دین وہی ہے جس کی تائید قرآن وسنت سے ہو اور کوئی دینی اصول اس سے نہ ٹوٹتا ہو۔ میں مناظرے کے طور پر نہیں بلکہ خالص افہام وتفہیم کے طور پر بعض خلاف دین امور کا ذکر کروں گا، جنہیں کچھ مسلمانوں نے جزو دین بنا لیا ہے! اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ میری بات کو رد کر دینا اور اپنے عقیدے پر اڑے رہنا میری دُنیا وآخرت کے لیے کچھ نقصان دہ نہیں، بلکہ اگر میری بات فی الواقع صحیح ہے تو نقصان ضد کرنے والے ہی کو ہو گا۔ میں تو بڑے ادب اور عجز کے ساتھ اس اللہ رب العالمین کی آیات اور اس صادق ومصدوق سرور کونین محبوب رب العزت ﷺ کی احادیث مبارکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جنہیں آپ واجب الاطاعت تسلیم کرتے ہیں۔ آپ خالی الذہن ہو کر خلوص، ایمانداری اور بردباری کے ساتھ غور وفکر کریں اور دیکھیں کہ جن اعمال وعقائد پر آپ والا وشیدا ہیں، ان میں کسی طرح کا سقم ونقص تو نہیں ہے، وہ رضائے الٰہی کی بجائے عتاب الٰہی کے تو باعث نہیں۔ پھر یہ بھی یقین فرمایئے کہ یہ گزارش میں اپنی طرف سے نہیں کر رہا بلکہ خود نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

"تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ کثیر اختلاف دیکھے گا۔ پس ایسی حالت میں تمہیں چاہیے کہ میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سُنّت سے چمٹ جاؤ اور اسے دانتوں سے پکڑ لو۔ اور خبردار! ہر بدعت یعنی دین میں نئے نئے کاموں سے بچنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانا جہنم ہے۔"

(سنن ابی داوٗد، کتاب السنۃ، حدیث ۴۶۰۷۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، حدیث ۲۶۷۶۔ حسن صحیح)

کیا آج کے دور میں اختلافات کا کچھ شمار رہ گیا ہے؟ کیا ٹھیک یہی دور نہیں جب نبی ﷺ کے اس فرمان کی تعمیل کی جائے؟

صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرز عمل:

یہ بات ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جن بدعتوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے روکا ہے وہ ایسی نہیں ہوں گی جن پر احکام ظاہری کے لحاظ سے ہر شخص ممنوع و منکر ہونے کا فتویٰ لگا سکے۔ ممنوعات و منکرات کی توضیح تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے متعدد مقامات پر کردی۔ بلکہ بدعت سے مراد وہی امور ہو سکتے ہیں جو بظاہر باعتبار شکل وشباہت دینی امور معلوم ہوں لیکن دین میں ان کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ ایسے ہی امور انسان داخل دین کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور ایسے ہی امور سے حصول ثواب کی غلط توقع وابستہ کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس حقیقت کو خوب سمجھا اور ایسی احتیاط برتی کہ حق ادا کر دیا۔ نمونے ملاحظہ ہوں:۔

✿ نماز فجر وعصر کے بعد امام کے دائیں یا بائیں مڑ کر کچھ دیر بیٹھنا امر معروف ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے بہ روایات صحیحہ اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اب عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے صحابی جلیل کو دیکھئے۔ فرماتے ہیں:

''تم میں سے کوئی شخص شیطان کو اپنی نماز میں حصہ دار نہ بنالے اس طرح سے کہ وہ صرف دائیں طرف مڑنے کی پابندی کرلے۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بار بار بائیں طرف مڑتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔'' (صحیح بخاری، مواقیت الصلوۃ، حدیث ۸۵۲۔ صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین)

مشہور عالم دین ملا علی قاری اپنی شرح میں اس کے تحت لکھتے ہیں:۔

''جس نے کسی امر مستحب پر اصرار کیا اور مضبوطی سے اس پر جما اور رخصت پر عمل نہیں کیا، پس یقیناً اس ذریعہ سے شیطان اسے گمراہ کرنے پہنچ گیا۔ (پس جب امر مستحب کا یہ معاملہ ہو تو) اس شخص کا کیا حال ہوگا جو بدعت یا منکر پر اصرار کرے۔''

آپ اگر یہ کہیں کہ ملا علی قاری کی بات ہم نہیں مانتے تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں مگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو آپ ایسا نہیں کہہ سکتے۔ خود ان کا یہ قول بتا رہا ہے کہ جو فعل بجائے خود مستحب ہو لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کی پابندی نہ کی ہو، اسے بھی پابندی کے ساتھ کرنا گویا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اس فعل کو ضروری سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ دین میں جس چیز کو جو درجہ دیا گیا ہے اسے اس سے زیادہ درجہ دینا بھی اسی

طرح برا ہے جس طرح کم درجہ دینا۔ پھر اس میں یہ بھی غور کیجئے کہ نیت اور عقیدے کا ذکر ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نہیں کیا۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ دائیں طرف مڑنے کو عقیدتاً ضروری سمجھنے والا اور دوسروں کو اس عقیدے کی تعلیم دینے والا گمراہ ہے۔ ایسے شخص کو تو کافر کہا جاتا کیونکہ وہ گویا بائیں طرف مڑنے کو گناہ ٹھہرا رہا ہے اور بائیں طرف مڑنا نبی ﷺ سے ثابت رہے۔ لہٰذا نعوذ باللہ! اس نے نبی ﷺ کو بھی گناہگار ٹھہرایا۔ ایسا نہیں بلکہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مجرد اس طرز عمل ہی کو شیطنت ٹھہرایا ہے کہ امام ہمیشہ دائیں طرف مڑا کرے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ کوئی بھی ایسا کام نکالنا جو عوام کے نزدیک تقرب الی اللہ اور ثواب کا ذریعہ ٹھہرے، حالانکہ قرآن وسنت سے اس کا اشارۃً بھی حکم نہ ملا ہو قطعاً بدعت ہے خواہ نکالنے والے کی نیت اسے ضروری قرار دینے کی نہ ہو۔

❁ یہی ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد ایک بار اپنے بعض شاگردوں کو دیکھا کہ ذکر وعبادت کے لیے ایک جگہ مقرر کر کے جمع ہوتے ہیں تو غصہ فرمایا اور تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اے لوگو! کیا تم رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ ہو! یا گمراہی کی طرف دوڑ رہے ہو!'' دُوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تو میں نے اس طرح کا ذکر نہیں دیکھا۔ پھر تم لوگ کیوں یہ نیا طریقہ نکال رہے ہو!'' نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سلسلہ رک گیا۔ غور کا مقام ہے! ذکر الٰہی جیسا مقدس فعل لیکن ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسا عظیم الشان صحابی اس پر خفا ہے۔ صرف اس لیے کہ دین کے رنگ میں رنگی ہوئی مصفا ترین بصیرت خوب دیکھتی ہے کہ جو طریقے ابتداء میں نہایت خلوص وللہیت سے نکالے جاتے ہیں، وہی کچھ عرصہ بعد کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ اور وہ یہ بھی دیکھتی ہے کہ شیطان، اللہ تعالیٰ کے مومن بندوں کو نبی ﷺ کی سنت اور اللہ تعالیٰ کے فرائض سے دور لے جانے کے لیے کیسے کیسے خوبصورت حربے استعمال کرتا ہے۔ وہ جن لوگوں کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ دنیاوی متاع کی چمک دمک پر مائل ہونے والے نہیں، ان کے لیے دین ہی کی نوعیت اور رنگ کے جال بنتا ہے۔ دام ہمرنگ زمین بچھاتا ہے اور اللہ کے بہت کم بندے اس کے کید سے بچ پاتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی کہ ذکر اللہ کے لیے ایسی اجتماعی شکلیں اختیار کی جائیں جن کی تعلیم عملاً یا قولاً رسول اللہ ﷺ نے نہیں دی!

❁ ترمذی میں نافع رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ:

''ایک شخص عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پہلو میں کھڑے ہوئے چھینکا اور کہنے لگا: الحمد للہ

والسلام علی رسول اللہ ۔ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:''یہ بات تو میں بھی کہتا ہوں ۔لیکن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس طرح نہیں سکھایا بلکہ یوں سکھایا کہ ہر حال میں الحمدللہ کہیں ۔''

(ترمذی بحوالہ مشکوۃ المصابیح، کتاب الآداب حدیث ۴۷۴۴، واسنادہٗ جید واخرجہٗ الحاکم ۔الالبانی رحمہ اللہ)

اندازہ کیجئے ۔والسلام علی رسول اللہ جیسا پاکیزہ جملہ لیکن ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے بھی پسند نہیں کیا۔کیوں؟صرف اس لیے کہ چھینک کے بعد صرف الحمدللہ کہنا رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے اور اسی پر اکتفا کرنا دین کا تقاضا ہے۔اس تقاضے کو آپ نے رسول اللہ ﷺ ہی سے سمجھا تھا اور یہ بات ان کی نظر میں تھی کہ جس جگہ رسول اللہ ﷺ نے لفظ''نبی'' استعمال فرمایا ہو وہاں کسی کو''رسول'' کہنے کا بھی اختیار نہیں!

ہوسکتا ہے کہ کوئی یوں کہے کہ اس حدیث کے بعد صاحب مشکوۃ نے ''ھذا حدیث غریب'' لکھا ہے اور صاحب مشکوۃ جب ایسا لکھتے ہیں تو بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس حدیث میں کسی طرح کا طعن ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہ الفاظ فی الحقیقت صاحب مشکوۃ کے نہیں بلکہ خود ترمذی کے ہیں۔اور ہر صاحب علم کو معلوم ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ ان الفاظ کو صاحب مشکوۃ کے معنیمیں استعمال نہیں کرتے بلکہ بارہا صحیح حدیث کے بارے میں بھی وہ فنی نقطہ نظر سے ایسا کہہ جاتے ہیں۔چنانچہ اس حدیث کو غریب اس وجہ سے کہا کہ اس کے رواۃ میں ایک راوی زیاد بن ربیع منفرد ہیں، لہٰذا اصطلاحاً اس پر''غرابت'' کا اطلاق ہوا۔ورنہ یہ راوی ہر لحاظ سے معتبر اور بخاری کے رواۃ میں سے ہیں اور حدیث صحیح ہے۔

❁ عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل کسے معلوم نہیں کہ آپ نے اس درخت کو کٹوا ڈالا تھا،جس کے نیچے رسول اللہ ﷺ نے بیعت لی تھی اور جس کی زیارت کرنے کے لیے لوگ آنے لگے تھے۔کیوں؟صرف اس لیے کہ اس درخت کا وجود عوام الناس میں بدعت وشرک پیدا کرے گا۔پھر یہ بھی عمر رضی اللہ عنہ ہی کا واقعہ ہے کہ سفر حج سے لوٹتے ہوئے جب راہ میں ایک ایسی مسجد پڑی جس میں رسول اللہ ﷺ نے نماز ادا فرمائی تھی تو لوگ اس کی طرف دوڑے۔اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ''اے لوگو!اہل کتاب انہی باتوں کی وجہ سے برباد ہوئے کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی یادگاروں کو عبادت گاہ بنا ڈالا۔''

اللہ اکبر!نگاہ عمر رضی اللہ عنہ کتنی دور دیکھ رہی تھی......!آپ آج اپنی آنکھوں سے بصیرت عمر رضی اللہ عنہ کا نظارہ فرمالیں۔نبی تو بڑی چیز ہے،نبی کی خاک پا جیسے بزرگوں کی قبروں اور درگاہوں کا حال دیکھئے۔

جہلا ہی نہیں پڑھے لکھے بھی آپ کو ملیں گے کہ خاک کے تودوں پر سر نیاز خم کیے ہوئے ہیں اور جس فرق کے آگے کبھی فرشتوں نے سجدہ کیا وہی فرق مٹی کے ڈھیروں کے آگے جھکا ہوا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے عظیم مومن و مسلم اور رسول اللہ ﷺ جیسے رسول اکرم کی محبت و عقیدت...... لیکن پھر بھی عمر رضی اللہ عنہ نے ایک تہہ نشین خطرے اور فتنے کو اس فعل حسن کی گہرائیوں میں دیکھ لیا۔ وہ فاروق رضی اللہ عنہ تھے، فاروق حق و باطل۔ انہی کے لیے زبان صادق و مصدوق ﷺ نے کہا تھا کہ ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوسکتا تو عمر ہوتا۔'' رضی اللہ عنہ!

بدعت اور ایجاد فی الدین سے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کو کتنا گریز تھا اس کے لیے اور بیسیوں آثار پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن مجھے چونکہ ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لیے اتنے ہی پر اکتفا کر کے آگے چلتا ہوں۔

قبر پرستی:

قرآن وسنت کے صریح احکام کے بالکل برعکس رواج پا جانے والی بدعات میں غالباً سب سے بدتر لیکن سب سے عام بدعت قبر پرستی ہے جو کافی پھیل چکی ہے اور جس کی بہت سی صورتیں شرک جلی میں داخل ہیں۔

ہمارے سامنے آج تک ایک بھی دلیل ایسی نہیں آئی جس سے معلوم ہوسکتا کہ مروجہ قبر پرستی قرآن یا حدیث کے کس حکم یا اصول کے تحت اختیار کی گئی ہے۔ ہمیں تو غور وفکر اور مطالعہ کے بعد یہی اندازہ ہوا کہ قبر پرستی کی تمام تر عمارت محض جہل، نادانی، نفس پرستی اور اندھی تقلید پر کھڑی ہوئی ہے۔ آپ کے غور وفکر کے لیے چند نصوص پیش خدمت ہیں:-

✔ مسلم اور ترمذی میں ہے:-

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قبروں پر مت بیٹھو اور ان کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھو۔''

(صحیح مسلم، کتاب الجنائز حدیث ۲۲۵۱۔ سنن ترمذی، کتاب الجنائز حدیث ۱۰۶۱)

اگر کسی کو اس سے یہ غلط فہمی ہو کہ یہاں تو قبر پر چڑھ کے بیٹھنے کو منع کیا گیا ہے تو یہ درست نہیں۔ کبھی اور کہیں بھی ایسا نہیں دیکھا یا سنا گیا کہ لوگ قبروں پر چڑھ کے بیٹھتے ہوں۔ لہٰذا نبی ﷺ کے حکم کو اس معنیٰ میں لینا گویا رسول اللہ ﷺ پر یہ الزام رکھنا ہے کہ آپ ﷺ عبث باتیں بھی فرمایا کرتے تھے۔ (نعوذ باللہ)۔ ظاہر ہے کہ منع اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو زیر عمل آتی ہو۔ زیر عمل یہی چیز آتی رہی ہے کہ لوگ

قبروں کے پاس بیٹھتے اور اس بیٹھنے کو متبرک سمجھتے رہے ہیں۔ باقاعدہ درگاہیں بنی ہیں اور وہاں نیاز مندیوں کے مختلف پیرائے اختیار کیے گئے ہیں۔اسی سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے!

حیرت کی بات ہے کہ لوگ آدم علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کو سجدے کیے جانے کی دلیل سے قبروں کو اور غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی دلیل لاتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کرنا تو درکنار قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے تک کو منع فرمادیا کہ اس میں اشتباہ کا اندیشہ ہے اور قبر کو سجدہ کرنے کا ابہام ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی نہ کہا جائے کہ نماز تو چونکہ قبلہ رخ ہو کر پڑھنی چاہیے، اس لیے قبر کی طرف نماز پڑھنے کو منع فرمایا۔ یہ حکم رسول ﷺ بلاشبہ اسی صورت میں ہے جبکہ قبر قبلہ کی طرف واقع ہو رہی ہو۔ ورنہ کون دیوانہ مسلمان ہوگا جو قبلہ کے سوا کسی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا۔

✔ مسلم اور ترمذی میں ہے:-

''علی رضی اللہ عنہ نے ابوالھیاج الاسدی سے فرمایا: ''کیا میں تمہیں اس مہم پر نہ بھیجوں جس پر رسول اللہ ﷺ نے مجھے بھیجا تھا۔ یہ کہ تم کسی مجسمہ کو مٹائے بغیر نہ رہو اور کسی اونچی قبر کو برابر کیے بغیر نہ چھوڑو!''

(صحیح مسلم، کتاب الجنائز، حدیث ۲۲۴۳)

یہ میں نہیں کہہ رہا، خلیفہ چہارم، رسول اللہ ﷺ کے داماد علی رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں۔

✔ بخاری و مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:-

''جب جان کنی کا عالم رسول اللہ ﷺ پر طاری ہوا تو آپ ﷺ نے چہرے پر چادر کھینچ لی۔ جب سانس گھٹتا، چادر ہٹا دیتے۔ اسی عالم میں فرمایا: ''یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا۔'' ایسا کہہ کر آپ ﷺ امت کو اس طرح کی حرکتوں سے ڈرا رہے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو خود رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف بھی کھلی رکھی جاتی۔ لیکن اس خوف سے کہ اسے عبادت گاہ بنا لیا جائے گا، بند رکھا گیا!'' (صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث ۴۴۴۱۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد)

اندازہ کیجیے! قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے رسول اللہ ﷺ کو کتنی نفرت و کراہت تھی۔ آپ ﷺ بہت ہی کم کسی کے لیے لعنت اللہ کہا کرتے تھے۔ لیکن اس فعل کے کرنے والوں پر نبی ﷺ عالم جان کنی میں کس دلسوزی سے لعنت بھیج رہے ہیں۔ پھر انبیاء علیہم السلام کی قبور کا جب یہ معاملہ ہو تو ان لوگوں پر کس قدر لعنت برسے گی جو انبیاء علیہم السلام سے بہت کم درجہ بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنائے ہوئے ہیں!

[اُمتیوں اور انبیاء علیہم السلام کا موازنہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہاں صاحب مضمون نے قبر پرستی کی نحوست ظاہر کرنے کے لیے ان

کا ذکر کیا ہے ــــ ادارہ]

✔ ذرا ملاحظہ کیجئے! غیر انبیاء کی قبروں کا ذکر بھی حدیث رسول ﷺ میں ملتا ہے۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبش کے دو ایسے گرجاؤں کا ذکر رسول اللہ ﷺ کے سامنے کیا جس میں انہوں نے تصاویر دیکھی تھیں۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا:

''ان لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب ان میں کوئی مرد صالح مر جاتا تو اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے اور صالحین کی تصویریں نقش کر لیتے۔ یہی لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوق ہوں گے۔''

(صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، حدیث ۴۳۴۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، حدیث ۱۱۸۸)

دیکھا آپ نے! آج کی درگاہ سازی و قبر نوازی سے کتنی مطابقت رکھتی ہے یہ حدیث۔ اور:

✔ موطا امام مالک کی روایت ہے:۔

''رسول اللہ ﷺ نے کہا: ''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا دینا جسے پوجا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا سخت غضب آئے اس قوم پر جو اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لے!'' (۱۸۵/۱)

✔ مسلم کی ایک اور روایت ملاحظہ کیجئے۔ قول رسول ﷺ ہے:

''خبردار رہو۔ تم سے پہلے لوگوں نے اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا تھا۔ خبردار! تم ہرگز قبروں کو عبادت گاہ نہ بنانا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں!'' (مسلم، کتاب المساجد)

روکنے اور منع کرنے کا وہ کون سا صریح اسلوب ہے جو اس سلسلہ میں سرور کونین ﷺ نے اختیار نہیں فرمایا۔ تنبیہ و تنذیر کے جو واضح ترین الفاظ تھے بار بار استعمال کیے۔ پھر بھی اگر مسلمان اس پر توجہ نہ کرے تو سوچئے کہ آخرت میں اس کے ساتھ کیا معاملہ رہے گا۔

✔ اور لیجیے۔ مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، موطا اور مسند امام احمد سبھی میں یہ روایت موجود ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ نے قبر کو گچ کرنے (چونے کنکریٹ وغیرہ سے پختہ کرنے سے)، اس پر بیٹھنے سے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا!''

(مسلم، کتاب الجنائز، ابن ابی شیبہ (۱۳۴/۴)، ترمذی ۱۵۵/۲، مسند احمد ۳۳۹/۳، ۳۹۹ بحوالہ ''قبروں پر مسجدیں اور اسلام'' از علامہ ناصر الدین الالبانی۔ (مترجم) الشیخ محمد صادق خلیل)

✔ اور دیکھیے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے:

''بدترین ہیں وہ لوگ جن کی زندگی میں قیامت برپا ہوگی اور بدترین ہیں وہ لوگ جو قبروں کو مسجدیں بنالیں گے!'' (مصنف ابن ابی شیبہ طبع الہند (۱۴۰/۱۴، رقمہا ۳۸۴۴، ۲۱۴۳۔ مسند احمد۔ رقمہا ۴۳۴۲)

✔ اور ملاحظہ کیجئے۔ ابن ماجہ، ترمذی، نسائی اور ابوداؤد کی روایت ہے:-

''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لعنت بھیجی رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور ان پر بھی جو قبروں کو مسجدیں بنالیتے ہیں اور ان پر چراغ جلاتے ہیں۔''

(سنن نسائی، کتاب الجنائز، حدیث ۲۰۴۷/ ابوداؤد، کتاب الجنائز، حدیث ۱۴۵۹/ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث ۱۵۷۵ و ۱۵۷۴ عن حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ و ۱۵۷۶ عن ابوہریرہ رضی اللہ عنہ / ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، حدیث ۳۲۰، حدیث حسن)

گویا عورتوں کے لیے نفس زیارت ہی قابل لعنت ہے خواہ وہ وہاں کوئی مشرکانہ فعل کریں یا نہ کریں۔ یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ محولہ بالا روایتوں میں ''مسجد'' سے مراد گنبدوں اور میناروں والی اصطلاحی مسجد ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ قبروں کو ایسی جگہ نہ بنالو جہاں عبادت کی قسم سے کوئی عمل کیا جائے یا میلہ لگایا جائے۔ چنانچہ یہ تشریح نبی ﷺ کے قول سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میرے لیے تمام روئے زمین مسجد اور پاک (جگہ) بنادی گئی!''

(صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، حدیث ۴۲۸۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، حدیث ۱۱۶۳/ سنن نسائی، کتاب المساجد، حدیث ۷۳۹)

ظاہر ہے کہ مسجد سے مراد یہی ہے کہ جہاں چاہوں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرلوں۔ یہ ضروری نہیں کہ مسجد نام کی خاص عمارت ہی میں عبادت ہو سکے۔ گھر، جنگل، ریگستان ہر جگہ نماز اور ہر عبادت ادا ہو سکتی ہے۔

کفار عرب کے کئی بتوں مثلاً ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کے بارے میں تو بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ تشریح منقول ہے کہ یہ سب قوم نوح علیہ السلام کے نیک لوگ تھے، جنہیں بعد میں بت بنا کر پوجا گیا۔ مشہور بت لات کے بارے میں ابن جریر نے مجاہد جیسے جلیل القدر عالم وفقیہ کی روایت بیان کی ہے کہ یہ ایک شخص تھا جو لوگوں کو خصوصاً حاجیوں کو ستو گھول کر پلایا کرتا تھا۔ گویا پہلے ہی سے اہل کفر میں نیک لوگوں کو ان کی موت کے بعد پوجنے کی بیماری چلی آرہی ہے اور یہی بیماری آج کثیر مسلمانوں میں پائی جاتی ہے۔ اتنی جرأت تو ان سے نہ ہوسکی کہ باقاعدہ بت تراش لیتے لیکن ''بزرگوں'' کی قبروں، بعض حالتوں میں جعلی قبروں تک کے ساتھ معاملہ پرستش اور بندگی ہی کا ہے!

قبروں پر میلے اور عرس:

ایک طرف تو اس حدیث کو دیکھئے جس میں تین مسجدوں کے سوا کسی بھی مسجد کی طرف باقاعدہ سفر کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب تو یقیناً نہیں کہ ہر طرح کے سفر ہی کو رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا، بلکہ باتفاق علماء اس کا یہ مطلب ہے کہ تقرب الی اللہ اور ثواب کی نیت سے صرف تین مساجد ہیں جن کی طرف سفر کرنا جائز ہے۔ مسجد اقصیٰ، مسجد حرام، مسجد نبوی ﷺ ان کے علاوہ تقرب الی اللہ کی نیت سے سفر نا جائز ہے۔

دوسری طرف وہ قول رسول ﷺ دیکھئے، جسے ابھی نقل کر آیا ہوں۔ یعنی ''میری قبر کو عید یعنی میلہ گاہ نہ بنا لینا۔''

''عید'' کا معنٰی ہے بار بار لوٹ کر آنا۔ ہر وہ جگہ عید ہے جہاں لوگ بار بار جاتے ہیں۔ ہر وہ زمانہ اور وقت عید ہے جس میں کوئی کام بار بار کیا جاتا ہے۔ ہر وہ مجمع عید ہے جو بار بار اکٹھا ہوتا ہے۔ روایات صحیحہ گواہ ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین اور ائمہ واتقیاء نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل کی اور قبر رسول ﷺ کو عید نہیں بنایا۔ وہاں کے لیے اوقات متعینہ میں جمع ہونا یا تنہا جانا جائز نہیں سمجھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض بغیر تعین وقت اور بغیر پابندی کے جاتے تو قبر پر کھڑے ہو کر صرف سلام کہتے، کیونکہ سلام کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم بہت دور ہی سے سلام کہہ لیتے!

یہ تو تھا تعلیم رسول ﷺ اور تعلیم صحابہ رضی اللہ عنہم کا حال! اب ذرا ہمارے زمانہ کے عرسوں اور سالانہ میلوں کا حال دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ کثیر مسلمان کس ''ذوق وشوق'' سے سال بہ سال قبروں کے میلوں میں جاتے ہیں اور لا تعداد خرافات ومنکرات میں مبتلا ہوتے ہیں۔

قبروں پر دعا:

قبروں پر جا کر اہل قبر سے کچھ مانگنا تو کھلا شرک ہے ہی لیکن قبروں پر جا کر براہ راست اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی فضیلت وخصوصیت بھی قرآن وسنت میں کہیں نہیں ملتی۔ یعنی ایسا کہیں نہیں ملتا کہ قبروں کے پاس دعا مانگنا نسبتاً بہتر اور وجہ برکت ہو۔ جتنی بھی روایات ہیں ان میں صرف مُردوں کے لیے دعا ہے یا بعض ایسے الفاظ ہیں جو عبرت کا فائدہ دیتے ہیں۔ مثلاً:

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ نَسْاَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ)) (صحیح مسلم، کتاب الجنائز، حدیث ۲۲۵۵، ۲۲۵۷)

"سلامتی پہنچے ان بستیوں کے مومن اور مسلم بسنے والوں پر۔ ہم ان شاءاللہ تم سے مل جانے والے ہیں۔ ہم اپنے اور تمہارے لیے عافیت کے طالب ہیں۔"

یہاں مقصد اصلی مرحومین کے لیے دعا ہے اور اپنے لیے خیر وفلاح کی طلب ضمناً ہے۔ ہمارے زمانہ میں مرحومین کے لیے دعا کا طریقہ تو ختم ہوا اور الٹی گنگا یوں بہی کہ "بزرگوں" کی قبروں پر جاتے ہیں اور ان کے لیے دعا تو اس لیے نہیں کرتے کہ ان کی نجات ومغفرت پر ہم ایمان لا چکے ہیں۔ خود اپنے لیے دعا کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ صاحب کی برکت وفضیلت سے دعا پر اثر ہو جائے گی۔

[اور اسے "فاتحہ پڑھنے" کا نام دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ اصطلاح اس ضمن کی شرعی اصطلاحوں سے بالکل ہٹ کر ہے۔ احادیث میں تو قبرستان میں جا کر قبروں کے مردوں کے لیے جو دعا بتائی گئی ہے، وہ ان کی مغفرت اور بلندی درجات کے لیے ہے، جسے دعائے مغفرت کہا جاتا ہے۔ "فاتحہ" کی یہ اصطلاح اہل بدعت نے پتہ نہیں کہاں سے گھڑلی ہے — ادارہ]

ایسا سمجھنا غلط اور خلاف شرع ہے، کیونکہ قرآن وسنت میں اس کے لیے کوئی تعلیم نہیں۔ معلوم نہیں کن لوگوں نے یہ گھڑ لیا کہ امام شافعی رحمہ اللہ یہ کہا کرتے تھے کہ "جب کبھی مجھ پر کوئی سختی آن پڑتی ہے تو میں امام ابوحنیفہ کی قبر پر آ کر دعا کرتا ہوں اور سختی دور ہو جاتی ہے۔" یہ محض جھوٹی روایت ہے جو نہ تو روایت کے مسلمہ اصولوں پر صحیح اترتی ہے نہ عقل وقیاس کے مطابق ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تو اپنی تحریروں میں قبروں کی تعظیم وتکریم مکروہ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے حجاز ویمن، عراق وشام اور مصر وغیرہ میں کتنے ہی صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کی قبریں دیکھیں لیکن کبھی کسی قبر کی طرف رجوع نہیں فرمایا۔ حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم تو ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بہ درجہا افضل وبرتر تھے۔ حق یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ جب بغداد میں تشریف لائے تو نہ وہاں کسی قبر پر لوگ دعا کے لیے آتے تھے نہ یہ ناقص طریقہ اس دور میں مروج تھا!

بعض لوگ مشہور صوفی معروف کرخی کی قبر کے متعلق کسی "بزرگ" کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ وہ قبول دعا کے لیے تریاق اور مجرب ہے اور خود معروف کرخی نے اپنے بھتیجے کو یہ وصیت کی تھی کہ میری قبر پر آ کر دعا کیا کرے۔ نیز بعض نیک لوگوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ صلحاء اور انبیاء کی قبروں پر آ کر دعائیں کیا کرتے تھے اور دعائیں قبول ہو جاتی تھیں۔ نیز بعض فقیہوں نے قبر پر قرآن خوانی کا جواز لکھا ہے، یا بعض لوگوں نے اپنے تجربے بیان کیے کہ فلاں شیخ کے "مزار" پر ہم نے دعا کی اور مقبول ہوئی یا بعض علماء اور زاہدین قبروں پر دعائیں کرتے اور جھکتے دیکھے گئے۔ لہٰذا یہ لوگ جاہل اور تارک

شریعت نہیں ہو سکتے!

اس طرح کی حجتیں لانا دین و شریعت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک دعا کے مقبول ہونے کا تعلق ہے تو کوئی بھی فیصلہ کن طور پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کس لیے مقبول یا رد ہوئی۔ دعا گھر کے کونے میں بھی مقبول ہوتی ہے اور قبر رسول ﷺ تک پر نا مقبول ہو جاتی ہے۔ دعا کافروں اور مشرکوں اور سخت گناہ گاروں کی بھی قبول ہوتی ہے اور کفار بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں عمل کی وجہ سے یا فلاں گرجا کی برکت سے دعا قبول ہوئی۔ ہندوؤں میں بھی عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں مندر یا فلاں استھان یا فلاں گھاٹ پر دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا کافروں اور مسلمانوں سب کی قبول و رد کرتا ہے۔ وہ رب العالمین ہے اور اگر کسی قبر پر دعا کرنے سے فوری قبولیت حاصل ہو جائے تو یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ مقبولیت اس قبر یا صاحب قبر کی برکت سے ہے بلکہ سمجھنا چاہیے کہ یہ وقت ہی اللہ تعالیٰ نے دعا کی قبولیت کا رکھا تھا اور اس وقت کسی بھی جگہ یہ دعا مانگ لی جاتی تو قبول ہوتی۔

[قبروں پر جا کر اپنے لیے دعائیں کرنا اور اس عقیدہ سے کرنا کہ قبر پر دعا جلد قبول ہوتی ہے! یہ عقیدہ اور فکر باطل اور گمراہ کن ہے۔ دین ایسی فکر اور عقاید سے منع تو کرتا ہے، تائید نہیں کرتا ——— ادارہ]

رہا بعض بزرگوں کا قول! تو اول تو اس قول کی روایتیں ہی مستند نہیں۔ دوسرے کسی شخص کا بزرگ ہونا اس بات کے لیے کافی نہیں کہ اس کا ہر اجتہاد درست ہی مان لیا جائے۔ اگر وہ مجتہد کا درجہ رکھتا ہے تو یوں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسے اس اجتہاد پر کوئی گناہ نہیں ہوا بلکہ ایک درجہ میں اجتہاد کا ثواب ہی ملا، لیکن جو لوگ محض تقلید میں اسے اختیار کرتے ہیں، وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔ کیونکہ مقلد کے لیے یہ مسئلہ اجتہادی نہیں بلکہ غلط اجتہاد کی پیروی ہے! قول کے بعد فعل کا نمبر ہے تو اس کا بھی یہی حال ہے کہ کسی بزرگ کا خصوصی فعل شریعت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہر دور میں قبروں کی تعظیم اور اس پر دعا کی مخالفت کرنے والے بہت علماء رہے ہیں۔ لہٰذا اگر کچھ علماء و صلحاء تعظیم و دعا کو درست بھی کہیں تو یہ مسئلہ اختلافی[1] ہوا اور اختلافی مسائل میں اللہ تعالیٰ کا کھلا حکم ہے کہ:

﴿......فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ......الخ﴾ (النساء۴: آیت ۵۹)

''جب تم میں کسی مسئلہ میں باہم اختلاف ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کی

---

[1] درحقیقت یہ مسئلہ اختلافی نہیں بلکہ غلط اجتہاد کا نتیجہ ہے —— ادارہ!

روشنی اس کا میں فیصلہ کرو۔"

اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ دعا کا قبول کیا جانا الگ بات ہے اور فعل ممنوع کی سزا الگ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کافر بت یا صلیب کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور اللہ اس کی دعا قبول کر لیتا ہے۔ تو کیا اس قبولیت کے باوجود اس کے یہ کافرانہ افعال مستحق سزا نہ ہوں گے۔ ہوں گے اور ضرور ہوں گے۔ اسی طرح قبر پر جا کر اگر کوئی مسلمان دعا کرتا ہے اور وہ قبول ہو جاتی ہے تو غلط اعتقادی اور ممنوع طرز عمل اختیار کرنے کا عذاب تو بہر حال اسے ملے گا!

[کسی قبر پر جا کر دعا مانگنے میں جس چیز کا سب سے زیادہ ڈر اور احتمال ہے، وہ یہ کہ دعا مانگنے والے کے عقیدہ میں شدید بگاڑ خصوصاً شرکیہ عقیدہ بننے کا خطرہ موجود ہے۔ اسی لیے اس فعل سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں صحیح عقیدہ کی نعمتِ عظمیٰ عنایت فرمائے اور ہمیں عقائد کے ہر طرح کے بگاڑ اور فتنوں سے محفوظ فرمائے، آمین ——— ادارہ]

پھر بعض دعاؤں کا قبول ہونا بھی عذاب الٰہی کی ایک شکل ہوتا ہے۔ آدمی اپنے نزدیک جو چیز مفید سمجھتا ہے وہ مانگتا ہے، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہی چیز اس کے لیے مصیبت و ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ جیسے مثلاً اولاد کی دعا قبول ہوتی ہے تو بعض حالتوں میں یہی اولاد ماں باپ کے لیے ہزاروں پریشانیوں کا سبب بن جاتی ہے...... وعلیٰ ہذا۔

زیارت قبور:

قبروں کی زیارت کا بیشک نبی ﷺ نے اذن دیا ہے، لیکن ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بیان کر دی ہے کہ موت کو یاد رکھو۔ موت کو یاد رکھنا ظاہر ہے کہ بجائے خود مقصد نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی موت کو یاد رکھے گا تو اچھے اعمال کی طرف راغب ہوگا، برائیوں سے بچے گا اور دنیا کی زندگی میں محو نہیں ہوگا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میں نے اللہ سے اپنی والدہ کی مغفرت کی اجازت چاہی تو منع فرما دیا گیا، مگر ان کی قبر کی زیارت کا اذن مانگا تو مل گیا۔"

دوسری روایت (صحیح مسلم، کتاب الجنائز) میں ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اور اس قدر روئے کہ جو اصحاب ساتھ تھے وہ بھی رونے لگے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے اپنی والدہ کے لیے مغفرت طلب کی تو انکار فرما دیا، لیکن قبر پر آنے کی اجازت دے دی۔ للہذا قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں!"

(صحیح مسلم، کتاب الجنائز، حدیث ۲۲۵۹ سنن نسائی، کتاب الجنائز، حدیث ۲۰۳۸)

نبی ﷺ کے طرز عمل پر غور کیجئے! پھر یہ دیکھئے کہ آج کتنے لوگ موت کو یاد کرنے قبروں پر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لوگوں نے اس علت حکم ہی کو فراموش کر دیا اور محض صالحین وغیر صالحین کی قبروں پر تقرب الی اللہ اور برکت وسعادت کے لیے میلے لگانے لگے اور موت کی عبرت انگیز ویرانی وخموشی کو راگ رنگ، شور وشر اور فسق وفجور میں بدل دیا۔ ویا حسرتا! زیادہ سے زیادہ مذکورہ فعل رسول ﷺ سے یہ نظریہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اپنے کسی عزیز وقریب یا دوست کی قبر پر بطور محبت جانا جائز ہے تو اس میں بھی چنداں اعتراض نہیں، لیکن یہ محض رسمی چیز نہ بن جانی چاہیے، نہ اسے اجتماعی شکلیں دینا درست ہے!

راگ رنگ قوالی:

''سماع'' کے نام سے جو خرافات ومنہیات رواج پا گئی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ قرآن وحدیث اور تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم سے تو ان کے جواز پر کوئی دلیل ملتی ہی نہیں۔ بس بعض بعد کے صلحاء کے عمل کو بنیاد بنا کر لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا اور اس میں اتنے بڑھ گئے کہ صریح محرمات ومنکرات کا ارتکاب کیا جانے لگا۔ اول تو پچھلے بعض بزرگوں نے جو ''سماع'' اختیار کیا، یہ ان کا ذاتی فعل تھا جو ہرگز حجت نہیں ہو سکتا۔ پھر انہوں نے بہت سخت شرائط اس کے لیے رکھیں، جن کی تفصیل ان کے قول وعمل میں ملتی ہے۔ آج یہ شرائط قطعاً نظر انداز کر دی گئیں اور محض لغویت وخرافات اختیار کر لی گئیں۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون صحیح العقل مسلمان ہو سکتا ہے جو خلوص کے ساتھ قرآن وسنت کا مطالعہ کرے اور پھر آج کل کے عرسوں، قوالیوں اور ناچ گانوں کی اہمیت کا وہم بھی کر سکے!

[''عرسوں'' وغیرہ پر ''قوالیوں'' اور ناچ گانوں کے حق میں ہلکی سے ہلکی ایک بھی دلیل کتاب وسنت سے نہیں مل سکتی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جن خرافات کو مٹانے اور ختم کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ تاکیدی انداز میں ارشادات فرمائیں، بعد کے ادوار میں وہی چیزیں امت میں جائز ہو جائیں۔ بناء بریں ''عرسوں'' وغیرہ پر ''سماع'' کی محفلیں اور قوالیاں وغیرہ یہ سب از قبیل خرافات ومنکرات ہیں۔ راہ چلتے ہوئے یا سفر کے دوران میں اتفاقیہ طور پر یا بلا قصد ہم نے ''قوالیوں'' کے اشعار میں شرک وکفر اور خرافات کی روح ہی پائی ہے، اعاذنا اللہ منہ! یہ قوالیاں ویسے بھی ''مذہب تصوف'' کا حصہ ہیں جو شرک وبدعات کی بہت سی راہیں نکالے ہوئے ہے۔۔۔ ادارہ]

لغت میں لفظ ''بدعت'' ہر اس کام کو کہتے ہیں جو نیا نیا کیا گیا ہو اور اس سے پہلے اس پر عمل نہ ہوا ہو۔ لیکن شریعت میں یہ لغوی مفہوم مراد نہیں بلکہ مراد صرف وہ نئے کام ہیں جنہیں دین کا جزو بنایا جا رہا ہو۔ یہ اتنی سیدھی اور صاف بات ہے کہ معاند یا احمق کے سوا کوئی اس سے اعراض وانکار نہیں کر سکتا۔

آدمی جو بھی کام کرتا ہے، اس کا کچھ نہ کچھ مقصد اور منشاء ضرور ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ مقصد دنیا کی کوئی منفعت و مصلحت ہے یا آخرت کی۔ اگر دنیا کی ہے تو شریعت کو اس سے کوئی دشمنی نہیں۔ بس وہ تو اتنا کہتی ہے کہ حلال و حرام کی جو حدیں اللہ و رسول ﷺ نے متعین فرمادی ہیں وہ نہ ٹوٹیں اور آپ ان حدوں میں رہتے ہوئے جس طرح چاہیں دنیاوی مفاد اور راحت و عزت حاصل کریں۔ مثلاً آپ نے ریل کا سفر کیا۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں ریل نہیں تھی۔ لہٰذا از روئے لغت ریل کا سفر بدعت ہوا، مگر اس کا مقصد خالی دنیاوی ہوتا ہے اور قرآن وسنت کے کسی لفظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اہل کفر کی ایجادات سے دنیاوی فائدہ نہ اٹھاؤ۔ بلکہ اس کے برعکس اہل کفر کی مصنوعات کا استعمال خود فعل رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ لہٰذا شریعت کے نزدیک یہ بدعت نہ ہوگی۔ اسی طرح دیگر امور ہیں جو کسی حکم شرعی کے خلاف نہ ہوں اور باعتبار دور مبارک ﷺ کے لغتاً بدعت ہوں، ان پر شریعت کو کچھ اعتراض نہیں۔ ہاں اگر ان سے کوئی شرعی حکم ٹوٹتا ہو تو بے شک شریعت ان پر معترض ہوتی ہے۔ مثلاً بینک کا کاروبار ہے۔ نبی ﷺ کے دور میں یہ کاروبار اپنی موجودہ شکل میں نہیں تھا۔ آج یہ دنیاوی مقاصد کے لیے رائج کرلیا گیا ہے، لیکن شریعت نے سود کے لیے جو احکام بیان کیے یہ کاروبار چونکہ ان کو جھٹلاتا ہے اس لیے شریعت کے خلاف ٹھہرا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کام کا مقصد دنیاوی نہ ہو بلکہ اخروی ہو۔ اس کے متعلق یہ دیکھا جائے گا کہ اس کا حکم قرآن وسنت میں موجود ہے یا نہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم وائمہ نے اسے قرآن وسنت کے کسی لفظ یا جملہ سے اخذ کیا ہے یا نہیں؟ اگر دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت موجود ہے، تو اس کام کے شرعی ہونے میں کوئی کلام نہیں، اور اگر کوئی صورت موجود نہیں تو دیکھا جائے گا کہ جس مقصد اور سبب کی خاطر یہ کام کیا جارہا ہے وہ مقصد اور سبب رسول اللہ ﷺ کے دور میں بھی موجود تھا یا نہیں؟ نیز اگر موجود تھا تو رسول اللہ ﷺ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے لیے عملاً اس کام کو کرلینے میں کوئی رکاوٹ حائل تھی یا نہیں؟ اگر وہ مقصد و سبب اس دور میں بھی موجود تھا اور اس کے حصول کے لیے آج جو کام کیا جارہا ہے، اس زمانہ میں بھی کرلینا ممکن تھا تو یقیناً کہا جائے گا کہ یہ کام بدعت شرعی میں داخل ہے۔ مثال کے طور پر بعض بدعت پسندوں کے اس طرز عمل کو لیجئے کہ وہ کسی ایک یا چند نمازوں کے بعد سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص وغیرہ پڑھنے کو نہ صرف اچھا سمجھتے ہیں بلکہ اس کی پابندی کرتے ہیں اور جو ان کی تقلید نہ کرے، اسے وہابی وغیرہ کہتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کا یہ عمل دنیاوی مقاصد کے لیے ہے یا دینی مقاصد

کے لیے؟ ظاہر ہے کہ دنیاوی فائدہ تو اس میں ذرہ برابر نہیں۔ یہ لوگ ثواب اور برکت ہی کے مقصد سے یہ فعل کرتے ہیں، جو اخروی فائدہ میں داخل ہے اور تقرب الی اللہ کے سوا اس کا کوئی نفع متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ پس یہ مقصد تو دور مبارک ﷺ میں نہ صرف موجود تھا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب بعد نماز فاتحہ اور سورۂ اخلاص کی پابندی نہ کر سکتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کسی قول و فعل سے نہ تو نبی ﷺ نے اس کی تعلیم دی نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل کیا۔ لہٰذا لازماً یہ بدعت ہے اور اس کو افضل و مقدس سمجھنے والا یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ اللہ کے تقرب اور حصول ثواب کے جن ذرائع سے میں واقف ہوں ان کا علم رسول اللہ ﷺ کو بھی نہ تھا۔ (نعوذ باللہ) اندازہ کیجئے! رسول اللہ ﷺ تو جمعہ کو متعین کر کے روزہ رکھنے کو بھی منع فرماتے ہیں کہ اس طرح لوگوں میں یوم جمعہ کے لیے ایسے فضائل متصور کر لیے جائیں گے جو اس میں نہیں ہیں! اور بعض مدعیان اسلام نئی نئی عبادتیں گھڑ کے ان پر خود جمتے اور لوگوں کو جماتے ہیں۔ حالانکہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص وغیرہ کی جو تعریفیں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں ان کا اقتضا صرف یہ ہے کہ مسلمان وقتاً فوقتاً انہیں پڑھتا رہے اور دوسروں کو بتائے کہ ان سورتوں کو پڑھا کریں مگر کسی وقت کے ساتھ انہیں خاص اور پابند کر دینا ایجاد و بدعت شمار ہو گا۔

کیونکہ جن مواقع پر ان کی پابندی اور دوام منقول نہیں ان مواقع پر پابندی کراتا گویا آزادی اور رخصت کا وہ حق سلب کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ و رسول اللہ ﷺ نے مومنین کو دیا ہے۔ اس حق کو سلب کرنے کا کسی کو کیا حق ہے!

دوسری مثال مولود کی ہے، جو نبی ﷺ یوم پیدائش پر سال بہ سال نہایت اہتمام اور پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ مثال اس لحاظ سے بڑی نازک ہے کہ جب اس کے بدعت ہونے پر کلام کیا جائے تو بدعت پسند حضرات عوام کو جذباتی باتوں میں پھنسا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "لو صاحب! یہ ذکر رسول ﷺ کو بھی منع کرنے لگے۔" حالانکہ ذکر رسول ﷺ سے تو منع کافر ہی کر سکتا ہے۔ ذکر رسول ﷺ اپنی جگہ مسلم، لیکن یہ یوم پیدائش پابندی سے منانے کا طریقہ اور منکرات و مکروہات سے آلودہ نمائشی محفلیں منعقد کرنے کا رواج کسی طرح شریعت کی میزان میں پورا نہیں اترتا۔ بزرگوں کا یوم ولادت منانا اگر برکت اور ثواب کا کام ہوتا تو ضرور نبی ﷺ انبیائے سابق علیہم السلام کا یوم پیدائش منایا کرتے، خصوصاً ابراہیم علیہ السلام کا تو ضرور مناتے!

حدیث ہے:

''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی یوم عاشورہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ پس آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ان لوگوں نے بتایا کہ یہ عظمت والا دن ہے۔ اس میں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو اور ان کی قوم کو نجات دی تھی اور فرعون کو غرق کیا تھا۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے بطور شکر کے روزہ رکھا تھا۔ اس لیے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہم موسیٰ (علیہ السلام) کے معاملہ میں تم سے زیادہ حقدار ہیں۔ پس آپ ﷺ نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور لوگوں کو رکھنے کا حکم دیا۔''

(صحیحین، بحوالہ مشکوۃ المصابیح، کتاب الصوم، حدیث ۲۰۶۷ و ابوداؤد، کتاب الصوم، حدیث ۶۷۲، ۶۷۳)

ان حدیثوں کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ دیکھیے روزہ بطور شکر ایک دینی فعل تھا۔ لہٰذا نبی ﷺ نے اسے قبول کر لیا، لیکن بطور شکر سال بہ سال عید منانا قبول نہیں کیا۔ کیونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ اس طریقہ میں کسی طرح بھی کوئی بھلائی نہیں۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کا یوم نجات اور غرقابی فرعون بداہتہً خوشی منانے کے لیے بہت کافی وجہ ہے۔ کم سے کم نفس ولادت سے تو اس کا مرتبہ زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف موسیٰ علیہ السلام کا فرعون جیسے جبار و قہار پر فتح پانا اور فرعون کا غرق ہو جانا صراحتہً خاص اور اہم واقعہ ہے جس پر خوشی منائی جانی عقلاً نامناسب نہیں۔ مگر جس چیز کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وجہ قربت نہیں بن سکتی اور عوام کے لیے اس میں فتنہ کے جراثیم پوشیدہ ہیں، اسے آپ ﷺ کیسے اختیار کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ میں نے اختیار کیا تو یہ امت کے لیے سنت بن جائے گا، اور دین کے اعتبار سے بے نتیجہ بلکہ فتنہ پرور باتوں کو سنت بنانا ایک سچے نبی ﷺ کے لیے ممکن نہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو چونکہ خود ہر نبی سے بلند مرتبہ تھے، اس لیے آپ ﷺ نے کسی نبی کا یوم ولادت نہیں منایا۔ چلئے مان لیا۔ لیکن کیا صحابہ رضی اللہ عنہم بھی انبیاء علیہم السلام سے افضل تھے؟ کیا نبی ﷺ کے نزدیک اگر یوم پیدائش منانا برکت و سعادت کا ذریعہ ہوتا تو آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کا حکم نہ دے سکتے تھے؟ پھر نبی ﷺ کے بعد خود صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اتنی دینی فہم حاصل نہ ہوئی کہ نبی ﷺ کا یوم ولادت منا لیا کریں!

ایک یہ گوشہ نکالا جاتا ہے کہ ہم تو میلاد بطور وسیلہ خیر کرتے ہیں، تاکہ لوگ دین کی طرف مائل ہوں۔

اس خیال ونیت کا ثبوت اگر عمل سے ملتا تو خیر بات وزنی تھی، مگر حال تو یہ ہے کہ ''میلاد'' کی محفلوں میں آیت قرآنی ﴿ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین﴾ کی بھی دل کھول کرنافرمانی کی جاتی ہے۔ کتابیں بھی غیر مستند پڑھی جاتی ہیں۔''قیام'' بھی کیا جاتا ہے، جو خلاف شرع اعتقاد کا نتیجہ ہے۔اور دن، تاریخ کی ایسی پابندی کی جاتی ہے کہ روزہ، نماز قضا ہو مگر یہ قضا نہ ہو۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ اگر اس خاص مہینہ میں پیدا ہوئے تو وصال بھی آپ ﷺ کا اسی مہینہ میں ہوا ہے، تو یہ مہینہ مسرت کے ساتھ شدید ترین غم اور عبرت کے اسباب بھی اپنے اندر رکھتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شئے فانی ہے!

بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ یوم ولادت منانے کا مقصد جو کچھ سمجھا جاتا ہے وہ نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین سب کے دور میں موجود رہا ہے اور کوئی رکاوٹ بھی ایسی نہیں رہی کہ یہ حضرات اس عمل کو نہ کر سکتے۔ جب انہوں نے نہیں کیا تو ثابت ہوا کہ یہ فعل بدعت ہے!

دوسری صورت لیجئے کہ سبب تو موجود تھا، مگر عمل میں رکاوٹ تھی۔اس کی مثال قرآن اور دینی کتابوں کو چھاپنا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی اشاعت ونشر کا مقصد دور مبارک ﷺ میں بھی موجود تھا اور آج بھی موجود ہے۔ اسی طرح علوم دینیہ کو پھیلانے کا مقصد تب بھی تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن اس زمانے میں پریس ایجاد نہیں ہوا تھا، لہٰذا چھپائی نہیں ہو سکی۔ اب پریس موجود ہے، لہٰذا چھپائی ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم قرآن کو محض تجارتی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ برکت وثواب اور نشر واشاعت کی خاطر چھاپیں تب بھی باوجود دینی ہونے کے یہ فعل بدعت شرعی شمار نہ ہو گا۔ کیونکہ اگر چہ یہ عمل دور مبارک ﷺ میں نہ ہوا اور مقصد عمل اس وقت بھی موجود تھا! لیکن اس عمل پر اس وقت قدرت ہی نہ تھی۔ اور چھپائی کا عمل بجائے خود کسی شرعی حکم کے خلاف نہیں۔ یہ معاملہ ثواب کی خاطر کتابیں چھاپنے اور پوسٹر وغیرہ شائع کرنے کا ہے!

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک نیا کام ہم نے جس مقصد کے لیے شروع کیا ہے، وہ اگر چہ آخرت سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ جس سبب کے لیے کیا جا رہا ہے وہ سبب ہی دور مبارک ﷺ میں موجود نہ تھا۔ مثلاً نبی ﷺ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کا قرآن جمع کرنا اور صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین کا حدیث کی کتابیں ترتیب دینا۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں سے حفاظت دین مقصود ہے۔ یہ مقصود اپنی جگہ بلاشبہ حق اور دینی ہے، لیکن قرآن وحدیث کے جمع وتدوین کے اسباب نبی ﷺ کی زندگی میں موجود نہیں تھے۔ آپ ﷺ کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ جمع وتدوین ضروری معلوم ہوئی۔ لہٰذا یہ وہ شرعی بدعت نہیں جسے

حدیث میں ''ضلالت'' کہا گیا ہے!

[اسے اور ایسے ہی دیگر امور کو کسی طرح بھی بدعت نہیں کہنا چاہیے۔ یہ تو اجتہاد ہے، جو دین کی نشر واشاعت اور ترویج میں مددگار اور ضروری ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا، نئے نئے پیش آمدہ مسائل میں قرآن وحدیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں ان کا حل نکالا جائے گا، جسے اصطلاحاً اجتہاد کہا گیا ہے۔ بناء بریں یہ امور شرعاً تو بدعت ہیں ہی نہیں، لغتاً بھی ان کو بدعت کہنے سے گریز کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کو گمراہی کی راہ نہ ملے —— ادارہ]

ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو سبب دورِ نبوی ﷺ میں نہیں تھا بلکہ بعد میں پیدا ہوا، وہ سبب بجائے خود مسلمانوں ہی کی کسی غلطی کا نتیجہ ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ مثلاً خطبہ عید بعد نماز عید مشروع ہے۔ اب بعد میں اگر مسلمانوں کا یہ حال ہو گیا کہ نماز ختم ہوتے ہی بھاگنے لگتے ہیں اور خطبہ نہیں سنتے تو یہ سبب اس بات کے لیے کافی نہیں سمجھا جائے گا کہ خطبہ نماز سے پہلے دے دیا جائے۔ کیونکہ یہ سبب قدرتی نہیں بلکہ مسلمانوں کی بے حسی اور بدعملی سے پیدا ہوا ہے!

بدعت کو پہچاننے کی یہ کسوٹی اگرچہ اس وقت ہمارے الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے آئی ہے، لیکن فی الحقیقت یہ ہماری ایجاد کردہ نہیں بلکہ قرآن وسنت کے بخشے ہوئے دین نے اسے بنایا ہے۔ آخر آپ بھی تو یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کا علم ہم لوگوں سے ہزاروں گنا زیادہ اور یقینی تھا۔ وہ آخری نبی تھے جسے دنیا کے سامنے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرکے تمام ممکنہ ذرائع کھول کر رکھ دینے تھے، اور وہ انہوں نے رکھ دیئے۔ ہماری عقلوں کو اتنی دسترس کہاں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رضا یا ناراضی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے قطع نظر کرکے کوئی یقینی فیصلہ کر سکیں۔ ٹھنڈے دل سے غور فرمایئے! ہم تو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ فجر کی نماز صرف دو رکعت اور مغرب کی تین کیوں ہے؟ باقی وقتوں میں چار رکعت کس لیے ہیں؟ عشاء کے بعد کس غرض سے وتر رکھے گئے ہیں؟ زکوٰۃ کی شرح ۲/۱ ۲ فیصد کیوں ہے، دو یا تین فیصد کیوں نہیں؟ ہمارا کام صرف اس قدر ہے کہ قرآن اور رسول اللہ ﷺ نے جو حکم فرمایا اسے پورا کریں۔ ایک غلام کو یہ زیب نہیں دیتا کہ آقا کے احکام میں حذف واضافہ کرے۔ بدعت کو صریح طور پر بالتکرار منع کیا گیا۔ اور ہم ہیں کہ اس منع کرنے والے کی صداقت ورسالت پر ایمان کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اپنی طرف سے نئے اعمال نکالتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ ان سے رسول اللہ ﷺ خوش ہوں گے[1]، اللہ کی رضا ملے گی، برکت حاصل ہو گی۔ جب اللہ تعالیٰ کے رب ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے رسول ہونے پر ہم ایمان لے آئے تو خود بخود یہ بات

[1] ہر مسلمان جو بھی دینی عمل کرے گا، محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرے گا —— ادارہ!

لازم آ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور ثواب و برکت حاصل کرنے کے لیے جو اعمال ہو سکتے تھے وہ نبی ﷺ نے قول و عمل سے واضح فرما دیے! اور جن اعمال کو اختیار نہیں فرمایا حالانکہ اختیار کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا، وہ یقیناً مفید ثواب و برکت نہ ہوں گے!

خیال آتا ہے کہ بدعت پسند حضرات عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایک جملہ کو اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ جملہ نماز تراویح کی باقاعدہ جماعت کے بارے میں ہے۔ الفاظ یہ ہیں: نعمت البدعة هذه! (کیسی اچھی ہے یہ بدعت) یہ الفاظ آپ نے ان لوگوں کے جواب میں فرمائے تھے جنہوں نے کہا تھا کہ یہ جو آپ نے پورے رمضان میں پابندی سے تراویح باجماعت کا سلسلہ مسجد میں شروع کرا دیا ہے، یہ تو بدعت معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکل نبی ﷺ کی زندگی میں نہیں تھی!

اس جملہ سے یہ دلیل پکڑی جاتی ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں: سیئہ اور حسنہ۔ حدیثوں کا مورد بدعات سیئہ ہیں اور بدعات حسنہ پسندیدہ و محبوب ہیں۔ جیسا کہ خود عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے معلوم ہوا۔ بظاہر بات بڑی ظاہر فریب ہے لیکن جب تجزیہ کیجئے تو تلبیس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حدیث کی ایک ایک کتاب اٹھا کر دیکھیے! کسی جگہ آپ کو نہیں ملے گا کہ شریعت نے بدعت کی دو قسمیں کی ہوں۔ جتنی بھی حدیثیں آپ نے بدعت کے بارے میں ابھی پڑھیں اور جتنی ان کے علاوہ ہیں سب میں "بدعت" بغیر کسی اضافت کے مطلقاً بولا گیا ہے اور مطلق کو مقید یا عام کو خاص کرنے کے لیے جب تک مضبوط قرینہ موجود نہ ہو، کسی کو تقیید یا تخصیص کی اجازت نہیں۔ بدعت کی تقسیم بعد کے لوگوں نے کی ہے اور اس لیے کی ہے کہ بعض امور ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں بدعت کا پہلو تو معمولی سا ہوتا ہے اور دینی نفع کا پہلو ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے امور کو بعض لوگوں نے بدعت حسنہ کا نام دے لیا۔ مثلاً بعض بزرگوں نے اپنی خاص طبیعت اور مزاج کے تحت یہ محسوس کیا کہ معرفت و تصوف کے اشعار ان پر بہت اثر کرتے ہیں، لہٰذا انہوں نے خوش آواز لوگوں سے انہیں سننا شروع کیا۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ یہ "سماع" بدعت ہے، لیکن اس سے ان کی رغبت الی اللہ زیادہ بڑھی اور تزکیہ نفس کے لیے اسے اپنے حق میں زیادہ مؤثر پایا۔ لہٰذا "بدعت حسنہ" قرار دے لیا۔ ہمہ شما کو یہ ہرگز جائز نہیں کہ ان کی تقلید کرے اور "سماع" کی بدعت کو جو ہر حال میں بدعت ہے، فعل حسنہ تصور کر لے۔ بہر حال بدعت حسنہ شرعی اصطلاح میں کوئی چیز نہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے جو بدعت کا لفظ فرمایا وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی کام کو پوری طرح مفید اور نفع بخش اور بہتر جان کر اختیار کر رہے ہوں اور اس پر کچھ لوگ آپ سے کہیں کہ یہ کام مفید نہیں بلکہ نقصان دہ

ہے۔تب آپ ان لوگوں کو جواب دیں کہ اچھا نقصان دہ ہی سہی مگر اس کا نقصان بڑا مفید ہے! ظاہر ہے کہ یہ متضاد قسم کا جملہ آپ نے اپنے اس یقین کی بناء پر کہا ہے جو آپ کو اس کام کے مفید و بہتر ہونے پر ہے!

اس دلیل کو اگر کوئی نہ مانے تو دوسری دلیل یہ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے یہ لفظ "بدعت" شرعی معنٰی میں نہیں لغوی معنٰی میں استعمال کیا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک ہی لفظ ہم بعض دفعہ لغوی معنٰی میں بولتے ہیں اور بعض دفعہ اصطلاحی معنٰی میں۔ موقع محل خود بتا دیتا ہے کہ لفظ کس معنٰی میں بولا گیا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ کو خوب معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حد درجہ کے تابع فرمان، ان کی سنت کے شیدا، ان کی ادا ادا کے متوالے، ان کے دین پر ثابت قدم نہایت عظیم صحابی تھے۔ جن کی تعریف میں نہ صرف یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان صداقت نظام نے بہت کچھ کہا ہے بلکہ متعدد بار وحی بھی ان کی رائے کے موافق نازل ہوئی ہے۔ ان کی زبان سے اگر کبھی کوئی ایسا جملہ نکلے جس کے دو معنٰی ہو سکیں تو عقل اور انصاف کا تقاضا کیا یہ ہے کہ وہ معانی مراد لیے جائیں جو رسول اللہ ﷺ کے صریح اقوال کے مخالف محسوس ہوتے ہوں، یا وہ معانی مراد لیے جائیں جن سے مخالفت نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جس کے دل میں ذرا بھی اللہ تعالیٰ کا خوف اور ایمان ہوگا وہ یہی مفہوم مراد لے گا جو رسول اللہ ﷺ کے اقوال کی تردید نہ کرتا ہو۔ چنانچہ اس قول عمر رضی اللہ عنہ میں لفظ "بدعت" اگر شرعی معنٰی میں لیا جائے تو اقوال رسول ﷺ کی تکذیب مترشح ہوگی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تو بدعت کو مطلقاً بالکلیہ مردود ٹھہرایا اور عمر رضی اللہ عنہ جیسے یوں کہہ رہے ہیں کہ نہیں تمام بدعتیں مردود نہیں بلکہ بعض بدعتیں محمود و مقبول بھی ہیں!

کیا عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کی طرف ایسے معانی کا گمان منسوب کرنا اہل علم و عقل گوارا کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتے۔ تب قرینہ خود بخود پیدا ہو گیا کہ بدعت کو لغوی معنٰی میں لو۔ یعنی اپنی مجموعی شکل و ہیئت کے اعتبار سے تو بے شک جماعتِ تراویح کی باقاعدگی اور پابندی وغیرہ کا اہتمام ایک ایسا کام تھا جو نیا تھا لیکن شرعی اعتبار سے یہ نیا نہ تھا، بلکہ شریعت ہی کا اقتضا اور منشاء تھا اور شریعت ہی اس کے لیے دلیل و شہادت مہیا کر رہی تھی!

[امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نماز تراویح کو باجماعت کرنے کا یہ فعل خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے سرانجام دیا تھا۔ اور ایسے اجتہادی معاملات حدیث کے مطابق "سنت الخلفاء الراشدین المهديين" کے تحت آتے ہیں، جن کی پابندی کا حدیث میں حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں نبی ﷺ نے فرمایا: "تم پر میری سنت کی پیروی لازم ہے اور میرے ہدایت یافتہ اور

دوسروں کو ہدایت کی طرف بلانے والے خلفاء کی سنت کی پیروی بھی لازم ہے۔'' (صحیح۔سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ ، حدیث ۴۶۰۷۔جامع ترمذی، کتاب العلم ،حدیث ۲۶۷۶) ----- ادارہ]

اصحاب سنن کے ہاں یہ روایت ملتی ہے کہ تراویح کا باجماعت پڑھنا، تنہا پڑھنے سے افضل ہے۔ یہ بھی روایت ملتی ہے کہ نبی ﷺ نے شروع رمضان میں دو یا تین راتوں کو تراویح جماعت سے پڑھی تھی، اور رمضان کے آخری حصہ میں بھی متعدد بار پڑھی تھی اور فرمایا تھا کہ ''جب آدمی امام کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے اور آخر تک شمار رہتا ہے تو اسے ساری رات کے قیام کا ثواب ملتا ہے۔'' (ابوداؤد، ترمذی، نسائی بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الصلوٰۃ، حدیث ۱۲۹۸، حسن صحیح) پورے مہینہ باجماعت تراویح نہ پڑھنے کا سبب بھی خود نبی ﷺ ہی نے بیان فرمادیا کہ ''میں اس خیال سے نماز کے لیے برآمد نہیں ہوا کہ کہیں وہ تم پر فرض نہ ہو جائے!'' (متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح المحقق للالبانی، کتاب الصلوٰۃ حدیث ۱۲۹۵) گویا نبی علیہ السلام کا تشریف نہ لانا اور باجماعت پابندی سے نہ پڑھنا اس لیے نہیں تھا کہ اس میں کوئی قباحت تھی، بلکہ اس لیے تھا کہ کہیں میرے دوام و ہمیشگی سے لوگ اسے فرض وواجب کا درجہ نہ دے بیٹھیں!

اب اندازہ فرمائیے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اگر رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد تراویح باجماعت کو مہینہ بھر پڑھنے کا طریقہ اختیار کیا تو شرعاً یہ کیوں کر بدعت ہو سکتا ہے۔ اس میں کسی بھی حیثیت سے شرعی مفہوم میں نیا پن نہیں۔ ہاں لغتاً یہ نیا ہے! اس کے علاوہ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین** ۔ اس لیے خلیفہ دوم عمر رضی اللہ عنہ کا کوئی طریقہ، کوئی اجتہاد، کوئی عمل بدعت شرعی ہو ہی نہیں سکتا! اس لیے کہ ان کے طریقہ پر چلنا تو حکم رسول ﷺ کا اتباع ہے۔ ان کی جو رائے دیگر اصحاب رضی اللہ عنہم نے درست مان لی وہ تمام اُمت پر لازم ہوئی اور جس سے کسی ایک یا چند اصحاب رضی اللہ عنہم نے اختلاف کیا اس میں اگرچہ ہمیں ان کی رائے ترک کر کے دوسرے صحابی کی رائے مان لینے کا اختیار ہو جاتا ہے، لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی رائے باطل یا بدعت پر محمول تھی! رضی اللہ عنہ۔

اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر عمر رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ اہل بدعت کے لیے واقعتاً بھی کوئی حجت اپنے اندر رکھتا ہے تو کیا وہ عمر رضی اللہ عنہ کے دیگر اقوال وافعال کو بھی حجت مانیں گے؟ اگر مان لیں تو ہمارا اور ان کا اختلاف ہی ختم ہے۔ کیونکہ عمر رضی اللہ عنہ ہی تو وہ ہیں جنہوں نے شجرۃ الرضوان کو کٹوایا اور کسی بھی چور دروازہ سے جیتے جی بدعت کو داخلہ کی اجازت نہیں دی۔ لیکن یہ حضرات دیگر اقوال عمر رضی اللہ عنہ اور اسوۂ

فاروقی کو لائق حجت نہیں سمجھتے۔تب انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ان کے ایک بے ساختہ اور متبادر جملہ کو بطور سند لائیں!

پھر ہم کہتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ کو تو بیشک یہ حق حاصل تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے کسی عام حکم میں کسی خاص دلیل سے کوئی استثنا نکال لیں۔ان کی دین شناسی، اصابت رائے اور تفقہ پر محض ان کا اسوہ ہی نہیں بلکہ سب سے مضبوط شہادت خود رسول اللہ ﷺ کی ہے۔علاوہ ازیں ان کی ''بدعت'' کو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا بخوشی قبول کر لینا بھی اس بات کی شافی دلیل ہے کہ یہ بدعت شرعی بدعت تھی ہی نہیں۔آخر صحابہ رضی اللہ عنہم کے کردار اور کمال ایمان سے کون واقف نہیں۔وہ دین کے معاملہ میں کیا عمر رضی اللہ عنہ سے دب کر خلاف حق کوئی فیصلہ قبول کر سکتے تھے۔ایسا کوئی بے سواد ہی سوچ سکتا ہے۔ہمارا تو ایمان ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے جان دے دینا آسان تھا مگر خلاف شریعت فیصلہ کو بخوشی قبول کر لینا ممکن نہ تھا!

بتائیے! صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد ایسا کون ہے جسے یہ اختیار دیا جا سکتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے کسی عام حکم میں بغیر دلیل شرعی کے اپنی رائے سے تخصیص کرے یا مستثنیات نکالے۔کون ہے جس کی بصیرت، تفقہ، بالغ نظری، دینداری، تقویٰ، اصابت رائے اور حب رسول پر خود رسول اکرم ﷺ کی مہر تصدیق ثبت ہو۔کوئی نہیں، ہرگز کوئی نہیں۔لیس علیہم بسلطان پھر کیسے بلا سند کے نئے طریقوں کو جزو دین سمجھا جائے۔

اجتہاد و بدعت:

دین میں نئی باتیں نکالنے سے ممانعت کی دلیلوں کا کوئی توڑ نہ پا کر بعض حضرات اپنی بعض بدعات کے لیے روایات تلاش کر کے لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان روایات سے ہم نے فلاں کام نکالا اور اس کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسے فقہی جزئیات کی۔گویا اجتہادی مسائل جس طرح بدعت نہیں جزو دین ہیں، اسی طرح ہمارا استنباط بھی بدعت نہیں جزو دین ہے!

بات قدرے جی لگتی ہے۔لیکن ہم ان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ کیا ان کے نزدیک اجتہاد کی تعریف یہ ہے کہ ہر عام و خاص آیات و احادیث سے اپنے علم و عقل کے مطابق مفہوم اور مطالب نکال لیا کرے، خواہ اس کے نکالے ہوئے مطالب ماہرین علم و فن کے فیصلوں کے خلاف پڑتے ہوں یا دین کے متفقہ احکام سے ٹکراتے ہوں۔اگر اسی کا نام انہوں نے اجتہاد سمجھا ہے تو انہیں اپنی عقل کا علاج

کرانا چاہیے۔اجتہاد کچھ مذاق نہیں ہے۔ساری دنیا مانتی ہے کہ کسی بھی علم وفن کے اصولوں سے فروعات کا نکالنا اور ایک جزئی کو دوسری جزئی پر قیاس کرنا انہی لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو اس علم وفن پر پورا عبور اور دسترس رکھتے ہوں، اور یہی عقل وانصاف کا نہ صرف تقاضا ہے بلکہ اس کے ماننے پر انسان مجبور بھی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہر علم وفن فاسد و باطل ہو جائے گا۔تب دین وشریعت جیسے مہتم بالشان علم کے باب میں یہ کون سمجھدار کہہ سکتا ہے کہ اس میں اجتہاد وقیاس کے لیے شرائط وقیود نہیں ہیں۔شرائط ہیں اور ضرور ہیں۔ چنانچہ اہل علم نے جانچ تول کر صرف انہی حضرات کو مجتہد مانا جن میں شرائط اجتہاد پائی جاتی تھیں اور یہی مجتہدین تھے جنھوں نے زندگیاں کھپا کر قرآن وسنت کے اصول وکلیات سے فروعات کا استنباط کر کے اسلام کا عظیم الشان قانون و دستور مدون کیا۔ان کے بعد اگر چہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا اور ہونا بھی نہیں چاہیے جبکہ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات میں اس کی لازماً ضرورت باقی رہتی ہے، لیکن انہی لوگوں کو اس کا حق دیا جا سکتا ہے جو اپنے کارناموں اور قول وفعل سے یہ ثابت کر دیں کہ ان میں شرائط اجتہاد پائی جاتی ہیں۔

جب یہ طے ہو گیا تو سمجھنا چاہیے کہ کسی شخص کا خواہ مخواہ یہ دعویٰ کرنا معتبر نہیں کہ اس نے اجتہاد کے ذریعہ سے کوئی نیا نظریہ یا اصول یا عمل قرآن وسنت سے نکالا ہے، جب تک وہ اپنا شرائط اجتہاد سے متصف ہونا عملاً ثابت نہ کر دے! ورنہ جس چیز کو وہ اجتہاد کہہ رہا ہے اسے تک بندی اور ہوائی قلعہ اور ثمرۂ ہوائے نفس کہا جائے گا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قبر پرستی اور راگ رنگ اور عرس وقوالی اور فاتحہ خوانی اور نذر لغیر اللہ اور اسی طرح کے امور رائجہ پر اجتہاد وقیاس کا دعویٰ کرنے والے شرائط اجتہاد سے تو کیا ان شرائط سے بھی پوری طرح متصف نہیں جو ایک اچھے مسلمان کے لیے قرآن وسنت نے بیان کیے ہیں، یا بعض اگر ان میں عملاً اچھے مسلمان ہیں بھی تو علم وفن میں اپنی مہارت و دسترس کا کوئی ثبوت انہوں نے دنیا کے آگے پیش نہیں کیا۔ایسی صورت میں ان کے ایسے اجتہادات کیوں کر قبول کر لیے جائیں، جو نہ تو قرآن وسنت کی میزان میں پورے اترتے ہیں نہ مجتہدین سلف نے ان کی تائید کی ہے اور نہ عقل سلیم انہیں مانتی ہے!

یہ تو ایک خرابی ہوئی۔دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ لوگ یا تو بالکل بوگس روائتیں لاتے ہیں جو حدیث کی معتبر کتابوں میں ہی موجود نہیں، یا معتبر کتاب میں موجود ہیں بھی تو ماہرین فن روایت نے ان کی کمزوری اور خطا واضح کر دی ہے، یا پھر صحیح روایت سے ایسے مطالب ومعانی پیدا کرتے ہیں جو قطعاً من گھڑت

ہوتے ہیں اور دوسری صحیح روایتیں ان کے خلاف ہوتی ہیں!

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

* ایک کتاب میں ہم نے دیکھا کہ جواز قبر پرستی کے سلسلہ میں روایت بیان کی گئی کہ:

''بعض علماء نے کہا ہے کہ جو کوئی رسول اللہ ﷺ کے مزار پر یہ آیت پڑھے، ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ...... الخ[1]﴾ اور پھر ۷۰ مرتبہ ''صلی اللہ علیک یا محمد'' کہے تو ایک فرشتہ پکار کر اس سے کہتا ہے کہ ''اے شخص! تجھ پر اللہ تعالیٰ کا درود ہو۔'' اس کے بعد اس شخص کی جو مراد ہو گی پوری ہو گی۔''

یہ روایت ہی اول تو ناقابل اعتبار ہے، باعتبار سند بھی اور باعتبار عقل و قیاس بھی۔ سند کا تو یہ حال ہے کہ اس کے راوی ایک شخص ابن ابی فدیک ہیں جو تابعی تک نہیں، اور انہوں نے جس سے روایت لی ہے وہ مجہول الحال شخص ہے اور عقلاً یوں کہ اول تو خیر القرون کے علماء سے اس طرح کی کوئی بات منقول نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ روایات اس صحیح حدیث کے بالکل خلاف ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ دس دفعہ درود بھیجتا ہے۔'' (صحیح مُسلم، کتاب الصلوٰۃ) اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ ستر مرتبہ درود بھیجنے والے کے لیے اللہ کی طرف سے سات سو درود ہوں لیکن ابن ابی فدیک کی روایت بتاتی ہے کہ ستر مرتبہ درود کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ سے صرف ایک درود ملا!

* ایک جگہ یہ روایت دیکھی کہ:

''فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جب کوئی معاملہ کسی طرح تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو اہل قبور سے مدد حاصل کرو۔''

یہ سو فیصد جھوٹی روایت ہے۔ علماء اس کے کذب پر متفق ہیں۔

* ایک یہ روایت دیکھی کہ:

''فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جو شخص میری قبر کی زیارت کرے گا میں قیامت کے دن اس کا شفیع و شہید ہوں گا۔''

یہ روایت ابن ابی الدنیا کی کتاب القبور میں ملتی ہے جسے ابن ابی فدیک سے نقل کیا گیا ہے۔ ہم

---

[1] الاحزاب ۳۳: آیت ۵۶ — (ترجمہ) ''اللہ اور اس کے ملائکہ نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔''

ابھی کہہ چکے ہیں کہ یہ شخص تابعی تک نہیں۔ انہوں نے یہ حدیث انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کی ہے۔ حالانکہ جب تک ابن ابی فدیک اور انس رضی اللہ عنہ کے درمیانی سلسلہ روایت کا پتہ نہ چلے، ہرگز روایت معتبر نہیں ہو سکتی۔ کسی مستند کتاب حدیث میں اس روایت کو نہیں لیا گیا اور لوگ ہیں کہ اس سے قبر پرستی کی ترکیب نکال رہے ہیں۔

* ایک یہ روایت سنی کہ:

''فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جس شخص نے میری اور میرے پدر ابراہیم خلیل اللہ کی زیارت ایک ہی سال کے اندر اندر کی، میں اس کے لیے جنت کا ذمہ دار ہوں۔''

یہ بھی ایجاد بندہ اور قطعاً بے بنیاد ہے!

یہ ناقابل اعتماد روایتوں کی مثالیں ہیں۔ ایک دو معتبر روایات سے قیاس واجتہاد بھی دیکھیے۔ بخاری میں روایت ہے کہ:

''ام سلیم رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی گرسنگی (بھوکا ہونا) کی خبر پاکر دو روٹیاں دوپٹہ کے پلو میں باندھیں...... '' یہ قصہ لمبا ہے۔ خاتمہ یہ ہے کہ ''نبی ﷺ نے ان روٹیوں کو ملیدے کی طرح تڑوایا اور برتن میں جو کچھ گھی لگا ہوا تھا وہ اس میں ٹپکا دیا۔ پھر نبی ﷺ نے از قسم دعا کچھ الفاظ اس پر پڑھے اور دس دس آدمیوں کو بلا کر کھلانا شروع کیا۔ اسی آدمیوں نے پیٹ بھر کھایا اور ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر بھر نے کھایا اور پھر بھی بچ رہا۔''

(صحیح بخاری، کتاب الاطعمہ، حدیث ۵۴۵۰)

اس روایت سے ایک سلیم العقل اور انصاف پسند مسلمان اس کے سوا کیا مطلب اخذ کر سکتا ہے کہ یہ منجملہ معجزات ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے صادر ہوتے رہے ہیں۔ آمنا وصدقنا! جو پل بھر میں آسمانوں کی سیر کر آئے، اس کے لیے ایسے معجزے اللہ تعالیٰ نے بہت سے دیئے۔ مگر بدعت پسند حضرات کو دیکھیے کہ وہ اس سے کھانے پر ''فاتحہ'' پڑھنے کا اجتہاد فرماتے ہیں! یاللعجب!

غور کا مقام ہے کہ نبی ﷺ نے کھانے پر ''فاتحہ'' نہیں پڑھی، بلکہ دعائیہ الفاظ ادا کیے اور آپ ﷺ کو امید تھی کہ اللہ تعالیٰ دعا کو قبول فرما کر کھانے میں معجزانہ برکت عطا کر دے گا۔ یہ امید پوری ہوئی اور کتنے ہی بھوکوں کے پیٹ بھر گئے۔ ہمارے ''فاتحہ'' خواں حضرات کھانے پر ''فاتحہ'' پڑھتے ہیں نہ کہ کوئی دعا۔ پھر مقصد ''ایصال ثواب'' ہوتا ہے نہ کہ کھانے میں اضافہ۔ قیاس واجتہاد کی آخر کوئی تک بھی ہو۔ سوچنے

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ مساکین وغرباء کو رسول اللہ ﷺ بھی کھانا کھلاتے تھے اور اتنا کھلاتے تھے کہ کوئی کیا کھلائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی غرباء پروری میں کم نہ تھے۔ سورۂ فاتحہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو یاد بھی تھی اور اس کے فضائل بھی وہ ہم سے زیادہ جانتے تھے، مگر کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے کھانوں پر اسے پڑھا ہو اور اس کا ثواب مردوں کی روحوں کو پہنچایا ہو۔

[''ایصال ثواب'' کے نام پر جو ''رسوم'' ادا کی جاتی ہیں وہ صریحاً بدعات ہیں اور ان کا دین سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ فی الحقیقت تو یہ ''پیٹ بھرنے'' کا سامان ہوتا ہے۔ اسلام کا جو نظریۂ ایصال ثواب ہے، وہ فطرت اور عدل کے عین مطابق ہے۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو: ''سنت و بدعت کی کشمکش'' ماہر القادری مرحوم ——— شائع کردہ: دار المسلم، لاہور ——— ادارہ]

❀ ایک اور روایت جواز ''فاتحہ'' کی پڑھیے:

''غزوۂ تبوک کے بارے میں مروی ہے کہ جب لوگ بھوکے ہو گئے تو عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے دعا کرانی چاہی۔ تب نبی ﷺ نے دستر خوان بچھوایا اور کہا کہ آ جاؤ، جس کے پاس جو کچھ ہے لے آو۔ اس پر کوئی مٹھی بھر جوار، کوئی مٹھی بھر کھجور، کوئی روٹی کا ٹکڑا...... غرض جس کے پاس کھانے کی قسم سے جو کچھ تھا لے آیا۔ معمولی سا ذخیرہ جمع ہوا۔ نبی ﷺ نے اس پر دعا فرمائی اور کہا کہ بھر لو اپنے برتن۔ تمام لشکر نے اپنے برتن بھر لیے اور خوب کھایا اور پھر بھی بچ رہا۔''

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث ۱۳۹، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الفضائل، حدیث ۵۹۱۲)

اس حدیث کے متن میں دعا بالبرکۃ کے الفاظ ہیں۔ یعنی نبی ﷺ نے ''فاتحہ'' نہیں برکت کی دعا پڑھی۔ اب عقل وقیاس کی کون سی قسم سے یہ ''فاتحہ'' کے لیے دلیل بن سکتی ہے۔ فی الحقیقت یہ روایت تو دعا یا کسی بھی سورۃ قرآنیہ کے پڑھنے پر دلیل نہیں کیونکہ یہ فعل رسول ﷺ از قسم احکام وعبادات نہیں بلکہ قبیل معجزات میں سے ہے۔ معجزہ انبیاء علیہم السلام کی خاص چیز ہے۔ اسی لیے تمام کتب معتبرہ اٹھا کر دیکھ لیجئے! کسی مشہور صحابی کو آپ نہیں دیکھیں گے کہ اس نے نبی ﷺ کے اس فعل کو حجت بنا کر کھانوں پر دعا یا ''فاتحہ'' یا کوئی سورۃ قرآنی پڑھنی شروع کر دی ہو۔

❀ ایک اور نمونہ دیکھیے:

''صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میری والدہ نے ایک برتن میں کھجور، کھانا اور گھی اور دہی کا مرکب بنا کر نبی ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ نبی ﷺ نے اس پر کچھ پڑھا، جو کچھ اللہ کو منظور تھا۔ پھر آپ ﷺ دس دس آدمیوں کو بلاتے گئے۔ تین سو کے قریب آدمیوں کو کھلایا، پھر مجھ سے کہا کہ اے

انس! اپنا باد یہ اٹھا لے۔ میں نے اٹھایا تو حیران ہو گیا کہ اب بھی اس میں کھانا اس سے زیادہ موجود تھا جتنا پہلے تھا۔"

(صحیح بخاری، کتاب الاطعمہ، حدیث ۵۴۵۰)

اس حدیث سے بھی مروجہ "فاتحہ" کا ذرہ برابر تعلق نہیں۔ معجزات کے باب میں جو شخص نبی ﷺ کی الٹی سیلٹی نقل کرتا ہے اسے صاحب علم تو کیا ہوش مند بھی کہنا مشکل ہے۔

ایسے ہی ایک حدیث قبروں پر پھول وغیرہ چڑھانے کے سلسلہ میں بطور دلیل لائی جاتی ہے کہ نبی ﷺ ایک مرتبہ دو قبروں کے پاس سے گزر رہے تھے تو آپ ﷺ نے کسی درخت کی ایک ٹہنی توڑ کر اس کے دو ٹکڑے کر کے دونوں قبروں میں گاڑ دی۔ جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ "اس قبر کی میت پر عذاب ہو رہا تھا۔ یہ ٹہنی مردے کے لیے دعائے مغفرت کرے گی!" (صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث ۱۳۶۱)

میں اہل عقل سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس سے کسی بھی پہلو سے قبور اولیاء پر پھول چڑھانے کا جواز نکلتا ہے؟ یہ روایت تو بتاتی ہے کہ نبی ﷺ نے پھول نہیں ٹہنی چھوائی تھی۔ آپ ٹہنی کی بجائے پھولوں کی بات کرتے ہیں۔ نبی ﷺ نے عذاب سے نجات دلانے کے لیے یہ عمل کیا تھا۔ آپ ان بزرگوں کی قبر پر بطور عقیدت و نیاز مندی پھول چڑھا رہے ہیں، جن کے متعلق آپ عذاب کا وہم بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ اور فرض کیجئے کہ آپ اپنے عزیز و اقرباء ہی کی قبروں پر ان کے عذاب کو ہلکا کرنے کے لیے پھول چڑھانے لگیں تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ آپ بھی خود کو رسول اللہ ﷺ کی طرح مقبول بارگاہ الٰہ سمجھتے ہیں۔ آپ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ کے "دست مبارک" کے ڈالے ہوئے پھول عذاب ہلکا کر دیں گے۔ یعنی آپ کے نزدیک میت کے عذاب کو ہلکا کرنے کی تاثیر دست رسول ﷺ میں اور دعائے رسول ﷺ میں نہیں تھی، بلکہ خود ٹہنی میں تھی۔ اور آپ لوگ ٹہنی نہ ملنے کی وجہ سے پھول چڑھا رہے ہیں کہ پھولوں میں بھی عذاب کم کرنے کی خاصیت ہے۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا!

کھلی ہوئی بات ہے کہ "مزاروں" پر پھول چڑھانا، منتیں ماننا، چادریں چڑھانا، کھانوں پر "فاتحہ" پڑھنا سب عجمی تہذیب و تمدن کے انعامات ہیں، جنہیں آپ نے اپنے دین کے سانچے میں ڈھال لیا ہے اور خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر آپ کو انعام آخرت دے گا ـــــ زہے خوش خیالی!

اجتہاد کا ذکر چھڑا ہے تو ایک اور مفید بات بیان کر دوں۔ اہل بدعت ویسے تو دُر مختار اور اس نہج کی

دیگر کتب فقہ کے احکامات و روایات کو خاطر خواہ لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ مگر کوئی بات اپنے مطلب کی مل جائے تو انہی کتابوں سے حجت پکڑنے لگتے ہیں۔ مثلاً درمختار وغیرہ میں انہیں یہ روایت نظر آئی کہ علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ عید کی نماز کے بعد عین عیدگاہ میں نماز پڑھ رہا ہے۔ آپ نے اسے نہ روکا۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ آپ کیوں نہیں منع کرتے؟ علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے ڈر لگتا ہے، کہیں میں بھی ان لوگوں میں شمار کر لیا جاؤں جنہیں اللہ تعالیٰ نے جھڑکا ہے: ﴿اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡہٰی ۝ عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی[1]﴾ (کیا اسے دیکھتے ہو جو بندہ کو نماز سے روکتا ہے) اہل بدعت کے لیے یہ روایت تو وحی آسمانی بن گئی اور عمل ابوتراب (رضی اللہ عنہ) حجت ٹھہر گیا۔ لیکن انہیں اگر مجمع البحرین کی وہ عبارت دکھائی جائے جس سے علی رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر اور عقیدہ اس مذکورہ طرز عمل کے برعکس معلوم ہوتا ہے تو ہرگز نہ مانیں گے۔ عبارت دیکھیے:

''ایک شخص نے عید کے دن ارادہ کیا کہ نماز عید سے پہلے کچھ نماز پڑھے۔ اسے علی رضی اللہ عنہ نے روکا۔ اس نے کہا: ''یا امیر المومنین! میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے پر عذاب نہیں دے گا۔'' علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے فعل پر ثواب نہیں دیتا جسے نہ تو رسول اللہ ﷺ نے خود کیا ہو نہ اس کا ایماء فرمایا ہو۔ پس تیری نماز فعل عبث ہوگی، اور فعل عبث حرام ہے!''

اہل بدعت کچھ کہیں لیکن طالبان حق ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ اعمال کے مستحق اجر و ثواب ہونے کے متعلق اس جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ کا کیا زاویہ نظر تھا، جس سے اہل ''طریقت'' تمام رشتہ ہائے ولایت جوڑتے ہیں اور جس کا زہد و اتقا مشہور زمانہ ہے۔ ہم بدعت کے مردود اور ناقابل اجر ہونے پر متعدد صفحات میں جو بات سلیقہ سے نہ کہہ سکے اسے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے چند لفظوں میں کس قدر سلیقہ، صفائی اور قطعیت کے ساتھ بیان فرما دیا۔ رضی اللہ عنہ!

اربابا من دون اللہ:

قرآن میں ایک دو جگہ نہیں بہت سی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ''اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ'' بنانے پر تنبیہ اور وعید آئی ہے۔ پیرایہ بدل بدل کر اللہ تعالیٰ نے شرک سے منع فرمایا ہے:

مثلاً: ﴿وَلَا تَدۡعُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ فَاِنۡ فَعَلۡتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیۡنَ﴾ (یونس ۱۰: آیت ۱۰۶)

---

[1] العلق ۹۶: آیت ۹، ۱۰

''اور مت پکارو اللہ کے سوا کسی کو کہ نہ کوئی تجھے نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔ پس اگر تو نے پکارا تو یقیناً تو ظالموں میں سے ہے!''

یا مثلاً: ﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ......الخ﴾ (سبا ۳۴: آیت ۲۲)

''(اے محمد ﷺ) کہہ دو بھلا پکارو تو اللہ کے سوا ان کو جن کے بارے میں تمہیں خوش فہمیاں ہیں۔ انہیں آسمانوں اور زمین میں ذرہ برابر بھی اختیار حاصل نہیں۔''

اب اگر اس طرح کی آیتیں سنا کر اہل بدعت سے گزارش کی جاتی ہے کہ مرحوم یا زندہ بزرگوں سے دعا کرنا ظلم و شرک ہے، اس سے باز آیئے۔ یہ لا حاصل ہی نہیں جہنم میں پہنچانے والا فعل ہے! تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیتیں تو ان کے لیے نازل ہوئی ہیں جو بتوں کو پوجتے تھے، کافر تھے، مشرک تھے۔ ہم نعوذ باللہ! بتوں کو کہاں پوجتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کہا جائے کہ آیات میں آخر بتوں کا ذکر کہاں ہے! وہاں تو من دون اللہ فرمایا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا۔ تو کیا اللہ تعالیٰ کے سوا صرف بت ہیں۔ مرحوم یا زندہ بزرگ اللہ میں داخل ہیں (نعوذ باللہ)! وہ کہتے ہیں کہ ہم پوجتے کب ہیں۔ گویا ان کے نزدیک پوجنا بس یہ ہے کہ ان کے آگے سجدہ کیا جائے، ان کی نماز پڑھی جائے۔ حالانکہ میں آپ کو قول رسول ﷺ ہی سے بتاؤں کہ پوجنا صرف یہی نہیں بلکہ پوجنا یہ بھی ہے کہ جس چیز کو آپ کے بزرگ حلال یا حرام کہہ دیں اسے آپ قرآن و سنت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے حلال یا حرام مان لیں۔ دیکھیے! قرآن میں آتا ہے:

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ (التوبہ ۹: آیت ۳۱)

''انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو اور مسیح ابن مریم علیہما السلام کو الٰہ ٹھہرا لیا ہے۔ حالانکہ انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک ہی معبود کی عبادت کریں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے!''

عدی بن حاتم جو ایک عیسائی تھے اور بعد میں ایمان لائے، انہوں نے جب یہ آیت سنی تو رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اہل کتاب نے اپنے علماء اور درویشوں کی عبادت تو کبھی نہیں کی۔ نبی ﷺ نے جواب دیا: ''عبادت تو نہیں کی مگر ان علماء و مشائخ نے بعض حرام چیزوں کو حلال کر دیا اور اہل کتاب نے

ان کی بات مان لی۔اسی طرح انہوں نے بعض حلال چیزوں کو حرام کر دیا اور اہل کتاب نے اسے قبول کر لیا۔"

[یہ حدیث صرف یہاں تک ہی نہیں، بلکہ اس سے آگے یہ بھی آتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا ایسا نہیں تھا؟ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! یقیناً ایسا ہی تھا کہ ہمارے علماء جسے حلال کہتے تھے (چاہے وہ حرام ہی ہو) ہم اسے حلال مان لیتے اور جسے وہ حرام کہتے ہم اسے حرام مان لیتے (خواہ وہ حلال ہی ہوتا)۔"—— (طبرانی کبیر، ص۹۲، ج ۱۷ بحوالہ صحیح سنن ترمذی، ج ۳، کتاب تفسیر القرآن، حدیث ۳۳۰۶۔حسن) ادارہ]

کیا یہ روایت صراحۃً نہیں بتاتی کہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنانے کا مطلب صرف پوجنا ہی نہیں بلکہ حرام و حلال کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر کسی کی بات کو حق اور قابل تسلیم سمجھنا بھی پوجنے ہی میں داخل ہے۔ عقل کا واضح تقاضا بھی یہی ہے کہ جب حلت و حرمت کا مکمل اختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے تو جسے بھی اس اختیار کا حامل سمجھ لیا جائے وہ اس سمجھنے والے کے نزدیک گویا الٰہ ہی ہوگا، چاہے وہ الفاظ کی حد تک اسے الٰہ مانتا ہو۔ آج آپ عام طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ لوگ اپنے شیوخ اور مرشدین کی ہر بات کو بلا چون و چرا حق مان لیتے ہیں، خواہ وہ قرآن و سنت کے صریح خلاف ہو۔ پیر قوالی سننے، طبلہ و ہارمونیم بجانے اور عرس کرنے کو قولاً اور عملاً کار خیر ٹھہرائے گا، اور مریدین آمنا و صدقنا کہہ دیں گے۔ حالانکہ یہ چیزیں قرآن و سنت سے حرام ثابت ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ نذر و نیاز، ٹونا ٹوٹکا سکھائے گا، باطل عقائد کا سبق دے گا اور یہ مان لیں گے! زبان ہی سے نہیں دل سے۔ کوئی لاکھ انہیں سمجھائے، آیات و احادیث سنائے، ائمہ و فقہاء کے ارشادات پیش کرے مگر توبہ! یہ سب کو اس دلیل سے ٹھکرا دیں گے کہ ہمارے اتنے بڑے پیر بھلا گناہ کا کام کیسے کر سکتے ہیں! یہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنالینا نہیں تو اور کیا ہے! یہ شرک نہیں تو شرک کس چڑیا کا نام ہے! یہ گمراہی نہیں تو گمراہی کسے کہتے ہیں!

دنیا میں فکر و نظر اور حرکت و عمل کی بے شمار راہیں ہیں۔ خواہشات کی تکمیل کے گوناگوں وسائل ہیں۔ مطلب برآری اور حصول مقصد کے ان گنت اسباب و ذرائع موجود ہیں۔ آدمی اگر ہوائے نفس اور عقل کے تابع ہو کر ہر طرف دوڑے، ہر قسم کے وسیلے اختیار کرے، ہر طریقہ کو حصول مقصد کے کام میں لائے۔ حلال و حرام، درست و نادرست اور ثواب و عذاب کی کچھ پرواہ نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور گمراہی اسے آگھیرتی ہے۔ پھر وہ راہ گمراہی پر ہی جہاں تہاں برباد و ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ مناسب و جائز حد تک جدوجہد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے، اس سے امید

باندھے اور اس کی طرف رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ بہ آسانی اسے کامیاب کر دیتا ہے اور وہ رنگ برنگی راہوں میں ٹھوکریں کھانے سے بچ جاتا ہے۔ اللہ رب العالمین کو چھوڑ کر قبروں اور پیروں سے امید کارسازی رکھنے والوں کا حال یہ ہے کہ مرادیں حاصل کرنے کے لیے وہ جائز و ناجائز کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتے اور جس قبر کے بارے میں شہرت سن لی کہ وہاں مرادیں ملتی ہیں، بس اسی طرف دوڑے۔

اللہ ذوالجلال والاکرام مومنین کا حال یہ بتلاتا ہے کہ:

﴿اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ......الخ﴾

(السجدہ ۳۲: آیت ۱۵)

''ہماری آیات پر ایمان وہ لاتے ہیں جنہیں اگر سمجھایا جائے اور ہماری آیات یاد دلائی جائیں تو سجدے میں گر پڑیں اور اپنے لائق تعریف رب کو یاد کرنے لگیں!''

لیکن بدعت پسند حضرات — خواہ وہ کسی ملک، کسی شہر، کسی قریہ کے ہوں، خواہ میرے ہی شہر کے ہوں، خواہ پردہ دار ہوں یا فاحش، خواہ صوفیت کے جامہ میں ہوں یا علم و تفقہ کے لباس میں — ان کا حال یہ ہے کہ آیات الٰہی سن کر رب العزت کے جلال و کبریائی کے احساس سے اثر پذیر اور متاثر ہونا تو کجا وہ برملا اپنے پیروں، مرشدوں اور بزرگوں کی ''آیات'' مقابلہ میں لاتے ہیں اور زبان و عمل دونوں سے ان کا یہ اعتقاد مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہمارے فلک رسا بزرگوں کی ''آیات'' سے کچھ زیادہ ضروری نہیں۔ (معاذ اللہ)!

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ......الخ﴾ (الروم ۳۰: آیت ۴۱)

''آدمیوں کی اپنی کارگزاریوں اور کرتوتوں سے خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا!''

جی بے اختیار چند اور آیات قرآنیہ نقل کرنے کو چاہتا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ﴾ (لقمان ۳۱: آیت ۲۰، ۲۱)

''اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ حالانکہ نہ ان کے پاس علم ہے نہ ہدایت اور نہ کتاب روشن! اور جب ان سے کہا جائے کہ جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا ہے اسے مانو تو کہہ دیتے ہیں کہ نہیں ہم تو وہی مانیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو جمے ہوئے پایا ہے۔ بھلا اگر

شیطان انہیں جہنم کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو پھر بھی!''

اسی سورہ میں ذرا آگے ہے:

﴿......اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ كَلِمٰتُ اللّٰهِؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ﴾ (لقمان ۳۱: آیت ۲۷)

''اگر روئے زمین کے تمام درختوں کو قلم اور سمندر کو روشنائی بنالیا جائے اور سات سمندر اور بھی روشنائی کے طور پر موجود ہوں، اللہ کی باتیں ختم نہیں ہو سکتیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا، زبردست حکمت والا ہے!''

یہ آیات قرآنیہ زیب سخن کے لیے نہیں، اس غرض سے نقل کی گئی ہیں کہ برادران اسلام ان پر خلوص نیت سے غور کریں۔ جو لوگ کارسازی وعطا کے لیے نعوذ باللہ! اللہ رب العزت کو ناکافی سمجھ کر مردہ یا زندہ بزرگوں کو پکارتے ہیں، قبروں اور استھانوں سے آس لگاتے ہیں، ٹوٹکوں، گنڈوں اور نجوم وسحر کے چکر میں پھنستے ہیں! کیا انہیں اللہ قدیر وتوانا کی ان لامتناہی قوتوں کا شعور ویقین ہو سکتا ہے جن کو اگر لکھا جائے تو تمام روئے زمین کے درخت قلم بن کر سات سمندروں کی روشنائی سے بھی انہیں پورا نہیں لکھ سکتے۔ یہ حضرات تو یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں خاکم بدہن محض تفریحاً فرمادی ہیں اور بندوں کے لیے ان میں کوئی سبق، کوئی نصیحت، کوئی تعلیم نہیں!

غلو کا جنون:

توحید حقیقی کی حقیقت ولذت سے بے خبر اور اسلام کی روح سے ناواقف لوگ کسی طرح ان حدود میں رہنا گوارا نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعہ سے صریح وجلی طور پر متعین فرمادی ہیں۔ وہ صالحین واتقیاء کو انسانیت کے مراتب وخصوصیات سے بڑھا کر الوہی صفات سے متصف کرتے ہیں اور جب صالحین کے ساتھ یہ معاملہ ہو تو...... رسول اللہ ﷺ تو افضل البشر ہیں۔ انہیں تو یہ حضرات بالکل الٰہ ہی بنا ڈالتے ہیں۔ سراپا وہی عقیدے، کھلم کھلا مشرکانہ عقائد، لغو ومکروہ واہیے! مبتدعین کی کتابیں دیکھئے اور ''صوفیوں'' کی محفلوں کے اشعار ملاحظہ کیجئے اور ''عرس'' وقوالی کی نعتیں سُنیئے۔ کیا نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھایا ہو گا جو مبتدعین نے رسول اللہ ﷺ کو بڑھایا...... اور لطف یہ کہ یہ بڑھانا اور غلو کرنا اس مقصد سے نہیں کہ نبی ﷺ کی پیروی اور فرمانبرداری میں بھی شدت وغلو کیا جائے، بلکہ عمل میں تو یہ حضرات اکثر وبیشتر متساہل اور تارک ملیں گے۔ غلو اور افراط صرف ہوائے نفس کے تحت کرتے ہیں۔ لذت سخن اور گرمیٔ گفتار کے لیے کرتے ہیں۔ دل پسند افعال کے جواز کے لیے کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ان کے نزدیک عالم الغیب بھی تھے، قادر بالذات بھی تھے، حاضر وناظر بھی تھے

بلکہ آج بھی یہ سب کچھ ہیں۔ سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون! ان کے گوناگوں مشرکانہ عقائد کی تفصیل میں جانے کے بجائے آیئے چند نصوص میں آپ کو دکھاؤں:

سب سے پہلے کلمۂ شہادت ہی کو دیکھئے کہ جس پر مدار ایمان ہے:

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔''

اس میں محمد ﷺ کی حیثیت عبد کو یعنی بندہ ہونے کو پہلے بیان کیا گیا، رسول ہونے کو بعد میں۔ یعنی ہر مسلمان رسول اللہ ﷺ کی عظمت وفضیلت جاننے سے پہلے یہ حقیقت اچھی طرح سے سمجھ لے کہ محمد ﷺ صرف ایک بندہ ہی ہیں، اللہ کے بندے۔ الوہی قوت وعظمت میں ان کی کوئی شرکت نہیں۔

پھر قرآن میں متعدد بار صراحت ووضاحت کی انتہائی ممکنہ حدوں تک نبی ﷺ کی عبدیت وبشریت کو بیان کیا گیا:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ......الخ﴾ (الکہف ۱۸: آیت ۱۱۰)

''(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے کہ میں تو ایک بشر ہوں۔ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ تمہیں بتاؤں کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔''

یہی تنبیہ وتوثیق سورۂ فصلت میں کی گئی۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ......الخ﴾ (آل عمران ۳: آیت ۷۹)

''یہ انہونی بات ہے کہ ایک بشر کو اللہ تعالیٰ کتاب اور قوت فیصلہ اور نبوت دے، پھر یہ بشر اللہ کو چھوڑ کر لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلائے۔''

گویا یہاں ایک قاعدۂ کلیہ بیان کر دیا گیا کہ جس کے بعد کسی بھی نبی کے لیے مافوق البشر سمجھے جانے کی گنجائش ہی موجود نہیں۔ سورۂ ابراہیم میں جملہ انبیائے سابق علیہم السلام کے قول کو بھی اسی حقیقت کی وضاحت کے لیے بیان فرمایا گیا:

﴿قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ......الخ﴾ (ابراہیم ۱۴: آیت ۱۱)

''رسولوں نے ان سے کہا کہ ہم تو صرف بشر ہیں تمہاری طرح، ہاں اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے پر چاہے احسان فرماتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے احسان فرما کر ہمیں نبوت عطا کی)۔''

آخر ان آیات سے زیادہ صریح اور کن الفاظ میں اللہ تعالیٰ یہ بتاتا کہ ہر نبی اور رسول فقط بشر ہوتا ہے۔ مافوق البشر اس میں کوئی قوت نہیں ہوتی۔ اور جو معجزہ اس سے ظہور میں آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا اور احسان ہے، بجائے خود نبی کے اقتدار و قوت کی دلیل نہیں۔ کن واضح اور بے ریب لفظوں میں اللہ تعالیٰ نبی سے کہلواتا ہے:

﴿قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾

(الاعراف ۷: آیت ۱۸۸)

''(اے محمد ﷺ) کہہ دیجیے کہ میں اپنی جان کے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں لیکن جو کچھ اللہ چاہے، اور اگر میں غیب کا حال جانتا تو اپنے لیے بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے برائی کبھی نہ پہنچتی۔ میں تو بس ڈرانے والا ہوں اور خوشخبری دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان لائیں۔''

بعینہ شروع کے یہی الفاظ سورۂ یونس میں وارد ہوئے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں پہلے ضرر ہے اور پھر نفع۔ سورۂ جن میں فرمایا گیا:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۝ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا﴾ (الجن ۷۲: آیت ۲۰،۲۱)

''کہہ دو کہ میں تو بس اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں کرتا۔ کہہ دو کہ میرے قبضہ میں تمہارا نقصان اور تمہیں راہ ہدایت پر لانا نہیں۔''

یہ تو چند آیات قرآنیہ ہوئیں! ذرا خود ارشادات رسول ﷺ کو بھی دیکھیے۔ انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

''کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! اے وہ کہ (آپ) ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے بیٹے ہیں! اور سردار اور سردار کے بیٹے......!''

بات پوری ہونے سے پہلے ہی نبی ﷺ نے قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا:

''اے لوگو! اپنے معمول کی باتیں کرو! اور تمہیں شیطان بہکا نہ دے۔ میں محمد (ﷺ) ہوں اللہ کا

بندہ اور اس کا رسول۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم لوگ مجھے اس درجہ سے بڑھاؤ جو درجہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے!''

(رواہ احمد وابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، حدیث ۴۹۰۰، واسنادہ صحیح۔ الالبانی رحمہ اللہ)

دیکھ لیجئے! کہنے والوں نے کوئی خلاف واقعہ بات نہیں کہی تھی، کوئی شرک نہیں کیا تھا۔ لیکن نبی ﷺ نے اس سے بھی روکا۔ اسے بھی شیطان کی درانداذی خیال فرمایا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ غلو پسندی آدمی کو کہاں تک لے جاتی ہے اور بے قید و بے محل قصیدہ پڑھنے والا مزاج و ذہن کس افراط وتفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے!

بخاری و مسلم میں عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''دیکھو! مجھے حد سے نہ بڑھانا جیسے عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو حد سے بڑھا دیا۔ میں صرف اللہ کا بندہ ہوں۔ لہٰذا تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔'' (صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث ۳۴۴۵، و۶۸۳۰)

مشکوٰۃ میں بخاری سے ایک حدیث منقول ہے کہ:

''کچھ بچیاں نبی ﷺ کے سامنے آپس میں کہنے لگیں کہ ہمارے بڑے بوڑھے بدر میں مارے گئے ہیں۔ ایک بچی نے کہا: ''ہم میں ایک ایسا نبی ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''یہ بات چھوڑو بلکہ وہی باتیں کرو جو تم پہلے کر رہی تھیں۔''

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث ۴۰۰۱ و کتاب النکاح، حدیث ۵۱۴۷)

یعنی اور باتیں کہے سنے جاؤ، یہ ''کل کی بات جاننے'' والا کلام چھوڑو۔ حالانکہ ہو سکتا تھا کہ ان بچیوں نے یہ جملہ اس مفہوم میں بولا ہو کہ نبی ﷺ چونکہ مرنے کے بعد کا حال بتا رہے ہیں، اس لیے گویا وہ آئندہ کی بات بتا رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے الفاظ علم غیب کی نشان دہی کر رہے تھے، اس لیے نبی ﷺ نے روک دیا۔

اور دیکھیے! مشکوٰۃ ہی میں نقل کیا گیا ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں اللہ کا رسول ہونے کے باوجود نہیں جانتا کہ میرے ساتھ اللہ کا کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا؟'' (صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث ۳۴۴۵)

حد ہے اس وضاحت و تصریح کی کوئی؟ ممکن رہا مومن کے لیے رسول اللہ ﷺ کو عالم الغیب یا حاضر

وناظر یا اور کسی حیثیت میں مافوق البشر ماننا؟ یقیناً نہیں!

﴿وَعِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ...... الخ﴾ (الانعام ۶: آیت ۵۹)

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ) ''اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، اس کے سوا انہیں کوئی بھی نہیں جانتا۔''

یہ تو چند آیات واحادیث ہیں۔ قرآن واحادیث دونوں ہی سے ناقابل انکار طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نہ عالم الغیب تھے نہ اللہ تعالیٰ کی طرح حاضر وناظر، نہ معجزات میں آپ ﷺ کی ذاتی قدرت کو دخل تھا نہ آپ ﷺ اپنے طور پر کسی کو ہدایت نصیب کرنے یا نفع ونقصان پہنچانے یا بخشنے پر قادر تھے۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔ جو شخص انہیں عالم الغیب کہتا ہے، وہ بقول عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بڑا بھاری بہتان باندھتا ہے۔ (حدیث کی سب سے مستند اور مقبول کتابیں بخاری اور مسلم اٹھا کر دیکھئے! یہی ملے گا کہ نبی ﷺ انسانوں کی طرح کبھی بھولتے بھی تھے، بعض خبروں کے منتظر بھی رہتے تھے، اصحاب رضی اللہ عنہم سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ دنیاوی امور میں آپ ﷺ کے خیال کا کبھی کبھار وہ نتیجہ نہیں نکلا جو نبی ﷺ سمجھتے تھے۔ جس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''انتم اعلمون امور دنیاکم''

مبتدعین کی جسارت کی انتہا ہے کہ صریح آیات واحادیث پر تو توجہ نہیں کرتے اور دور دراز باتیں ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ مثلاً وہ روایت انہیں نظر پڑ گئی جس میں نبی ﷺ نے ایکم مثی کھہ کر لست کاحد کم فرمایا ہے۔ یعنی ''تم میں سے کون میری مانند ہے۔ میں تم جیسا نہیں ہوں۔'' بس پھر کیا تھا، ساری آیات قرآنیہ اور احادیث صریحہ وصحیحہ پس پشت ڈال دی گئیں اور کہا گیا کہ دیکھا! نبی ﷺ خود فرما رہے ہیں کہ میں تم جیسا نہیں۔ اور اس ''تم جیسا نہ ہونے کا'' مطلب ان کی نگاہ میں یہ ہوا کہ اب جتنی چاہے صفات الوہیہ اور مافوق البشر قدرتیں نبی ﷺ کے لیے فرض کرتے چلے جائیں۔ اگر عرض کیا جائے کہ اس کا یہ مشرکانہ مطلب نہیں بلکہ نبی ﷺ کا فضیلت اخروی کے علاوہ قوائے انسانیہ میں نسبتاً ممتاز ہونا سب پر ظاہر ہے، اسی امتیاز وفرق کی طرف نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے رسول خاص ہونے کی بناء پر ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ سب سے جداگانہ ہونا بھی چاہیے۔ تب یہ کہیں گے کہ نہیں صاحب! آپ غلط کہتے ہیں!

خیر ہماری بات چھوڑیئے، آیت قرآنی دیکھئے! اللہ تعالیٰ سورۃ الاحزاب میں امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن سے خطاب فرماتا ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسۡتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ ...... الخ﴾ (الاحزاب ۳۳: آیت ۳۲)

''اے نبی ﷺ کی عورتو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔''

اگر نبی ﷺ کے ''لست باحد کم'' کا مطلب یہی ہے کہ نبی ﷺ کے لیے اب ہر فوق البشر قوت وقدرت کے اثبات کا دروازہ کھل گیا تو امہات المومنین، ازواج مطہرات رضی اللہ عنھن کے لیے بھی اس کا دروازہ کھول دیجئے، ان کو بھی عالم الغیب اور حاضر وناظر مانیے۔ وہ تو حدیث ہی تھی، یہ قرآن ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

میں ابھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن وقت کی کمی اور طوالت کے خوف سے رک جاتا ہوں۔ تاہم جو کچھ میں نے کہا ہے، وہی اتنا کافی ہے کہ اگر اس پر خلوص اور دیانت سے توجہ کی جائے تو کتنی ہی برائیوں اور غلط عقائد سے پناہ مل سکتی ہے! مجھ کم حیثیت اور بے بضاعت کی نہیں، اس فرماں روائے مطلق اور حاکم حقیقی اور مالک وخالق کی سنئے جو فرماتا ہے کہ:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ......الخ﴾

(الروم ۳۰: آیت ۴۳)

''سیدھا رکھو اپنا منہ سیدھی راہ پر۔ اس سے پہلے کہ وہ دن آ پہنچے جس کا ٹلنا اللہ کی طرف سے مقدور نہیں۔''

امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ''اس امت کا آغاز جس چیز سے سنورا ہے اسی سے اس کا آخر بھی سنورے گا۔'' آج کے ہمہ گیر بگاڑ کو سنوارنا ہے تو اپنے اپنے گروہی معتقدات اور عصبیتوں کو چھوڑ کر قرون مبارکہ کی طرح قرآن وسنت کی طرف آئیے اور قرآن وسنت ہی کو عقیدہ وعمل کا منبع بنائیے!

بدعت کے عظیم نقصانات:

آپ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ پر غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کو اگرچہ غیر مسلم قوموں سے بارہا عظیم نقصان پہنچا ہے لیکن خود ''اسلام'' کو ان سے ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچا۔ یہ حقیقت آپ اس وقت ٹھیک طرح سمجھیں گے جب یہ غلط خیال اپنے دماغ سے نکال دیں کہ اسلام اور مسلمان ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، یا یہ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے نمائندے اور ترجمان ہیں۔ اس غلط خیال کو صراحتاً تو کوئی بھی سمجھدار ظاہر نہیں کر سکتا، لیکن عملاً دیکھا جا رہا ہے کہ مدت سے عوام میں ان دونوں کے مقام ومنصب اور حقیقی فرق کا صحیح شعور موجود نہیں! اور بعض پڑھے لکھے تک اپنی تحریروں میں ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں کہ جیسے اسلام قرآن وسنت اور اجماع وقیاس تک محدود نہیں، بلکہ بعض ''اولیاء'' اور

اتقیاء کے ذاتی رجحانات وعادات بھی اس کا جزو لازم ہے۔ یا یہ کہ کوئی عابد و زاہد شخص اگر بعض اعمال سرانجام دیا ہے تو ان اعمال کو قرآن وسنت پر پیش کیے بغیر بھی اسلام کی ترجمانی اور نمائندگی کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے، یا اگر کسی مسلمان بادشاہ نے کچھ اسلامی قوانین رائج کیے تو اس کے تمام رائج کردہ قوانین اور طریقوں کو قرآن وسنت کی مطابقت کے بغیر اسلامی کہا جا سکتا ہے۔ اس غلط خیال کو عام کرنے میں اس سیاسی اصطلاح کو بھی دخل حاصل ہے جو مسلمانوں کی ہر سلطنت کو ''اسلامی سلطنت'' کہہ دینے کی شکل میں رائج ہوئی۔ بہر حال یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام الگ چیز ہے اور مسلمان الگ۔ اسلام ایک نظام حیات اور دستور زندگی ہے جو قرآن وحدیث اور اس سے مستنبط کی ہوئی مستند کتابوں میں تحریر ہے اور مسلمان وہ ہے جس نے اس نظام و دستور پر ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ مدعی اگر اس ایمان کے عملی تقاضے پورا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے اور جو امور اس دستور میں جرم و گناہ کے خانہ میں درج ہیں انہیں اختیار کر لیتا ہے تو یہ قصور خود اس کا ہے اور محض اس بنیاد پر کہ وہ اسلام کو قبول کرنے کا دعویدار ہے، اس کے جرم و گناہ کو نیکی اور بھلائی کے خانہ میں نہیں لکھا جائے گا۔

یہ سیدھی سی بات سمجھ لینے کے بعد یہ جاننا بالکل آسان ہے کہ اہل کفر نے مختلف زمانوں میں مسلمانوں پر جو تاخت کی اور ان کی سلطنتیں چھینیں اور جان و مال برباد کیا اور ان پر طرح طرح کے ظلم توڑے تو بے شک وہ مسلمانوں کا نقصان تھا، لیکن نفس اسلام پر اس کی زد نہیں پڑی۔ نفس اسلام کا نقصان تو یہ تھا کہ اہل کفر اس کے اصولوں یا جزئیات وفروعات میں کچھ غیر اسلامی نظریات وفروعات اس طرح خلط ملط کر دیتے کہ انہیں اسلامی دستور سے الگ ہی نہ کیا جا سکتا، اور جس طرح دیگر اہل کتاب کے دین غلط و صحیح کا ایسا مجموعہ بن گئے کہ ان کی تنقیح ممکن ہی نہیں رہی ایسا ہی یا اس سے کچھ کم حال اسلام کا بھی ہو جاتا۔ لیکن اہل کفر ایسی کوئی خرابی پیدا نہ کر سکے۔ اس کی وجہ جہاں یہ تھی کہ اسلامی مزاج براہ راست اہل کفر سے کوئی نظریہ ونصوص قبول کرنے کو تیار نہ تھا، وہیں یہ بھی تھی کہ اسلامی ماہرین ومجاہدین نے دستور اسلامی کی تدوین اور تحفظ کے ایسے مضبوط اور محکم طریقے اختیار فرمائے تھے کہ کسی غیر مسلم قوم کے لیے ان میں رخنہ اندازی اور فساد انگیزی ممکن ہی نہ تھی۔

[اسی بات کو دوسری طرح سے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی مریض کو طبیب دوائی دینے کے ساتھ پرہیز کرنے کی کچھ ہدایات دیتا ہے۔ اب اگر مریض ان ہدایات پر جان بوجھ کر عمل نہ کرے اور بدپرہیزیاں کرتا رہے تو نقصان خود اس کا ہی ہوگا، طبیب پر اس کا کچھ بھی منفی اثر نہیں پڑے گا۔ ٹھیک یہی معاملہ اسلام اور مسلمانوں کے درمیان ہے، جس کی طرف صاحب مضمون نے اشارہ کیا

ہے ــــ ادارہ]

ہاں نقصان اگر اسلام کو پہنچا ہے تو ان مسلمانوں سے جنہوں نے میدان تکلم کی شہسواری کے شوق میں عجمی فلسفے، طرز فکر، رجحان ومزاج، اسٹائل، آئیڈیالوجی اور افراط وغلو کو اسلام میں لا گھسایا۔ یہ حضرات چونکہ نہ صرف مسلمان تھے بلکہ بہت سے ان میں عبادت گزار اور عالم اور صاحب جبہ ودستار بھی تھے اور حق یہ ہے کہ ان کی متکلمانہ زور آزمائیوں سے اسلام کو کتنے ہی محاذوں پر فائدہ بھی پہنچا اور مسلمان ان کی وجہ سے باطل پرستوں کے مقابلہ میں سرخرو بھی ہوئے! لیکن ساتھ ہی کچھ غیر اسلامی نظریات اور نکات اور طریقے ان کے ذریعہ سے اسلام میں اس طرح گھس آئے کہ وہ کثیر مسلمانوں کی نگاہ میں اسلامی ہی ٹھہرے اوران کے اثرات دین کی جڑوں میں پھیلتے چلے گئے۔

یا پھر دین خالص کو نقصان ان لوگوں سے پہنچا ہے جو علم وعمل کے اعتبار سے خاصے اچھے تھے، مگر انہوں نے اپنے مزاج اور افتاد طبع اور علمی اعتبار سے ناقص اجتہاد کے تحت کچھ نئی عبادتیں نکالیں، کچھ نئے طرق طاعت بنائے، کچھ نئے معمولات بشکل دین اختیار کیے۔ یہ لوگ چونکہ عملاً نیکوکار اور عابد وزاہد تھے، اس لیے عوام نے ان کی نکالی ہوئی بدعتوں کو دین سمجھ کر قبول کر لیا اور بہت سے ان خواص نے بھی انہیں قبول کیا جو یا تو قرآن وسنت کا گہرا علم نہ رکھتے تھے یا ان حضرات سے خصوصی عقیدت ان کے دل میں تھی۔ بہرحال بدعتیں چلیں اور جیسا کہ نفسیات کا تقاضا ہے لوگوں نے ان میں سے نئے نئے سوت اور گوشے اور شوشے نکالے۔ بدعت جو اسلام کی نگاہ میں قانون شکنی اور بغاوت کے انداز کی شئے ہے، اپنا مزاج بھی جرموں ہی جیسا رکھتی ہے۔ ایک جرم کرنے کے بعد آدمی دوسرا جرم بھی نسبتاً آسانی سے اور تیسرا پورا ڈھٹائی سے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بدعت اختیار کرنے کے بعد دوسری اور تیسری اور چوتھی کی طرف پیش قدمی کرنا عوام اور بعض خواص کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ شیطان کی شعبدہ گری ایک طرف، بے عملی بلکہ بدعملی کے قبیح اثرات دوسری طرف! کم علمی مستزاد اور عجمی ماحول وتمدن کے عوامل نورٌ علیٰ نور۔ نتیجہ وہی ہوا جو آج سب کے سامنے ہے۔ مسلمانوں نے اسلام ہی کے نام پر گمراہی کو سینوں سے لگایا، اندھیرے کو اجالا سمجھا، سانپ کو مچھلی جانا۔

اصل یہ ہے کہ جن متکلمین کا میں نے اشارۃً ذکر کیا، ان کا پہنچایا ہوا نقصان نسبتاً کم اور مبتدعین کا اس سے بہت زیادہ تھا۔ بلکہ گہرائی میں جائیے تو متکلمین کے غیر اسلامی نظریات ومباحث بھی بدعت ہی کی قسم سے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کے ساتھ ''علمی'' کا لفظ بڑھا دیجئے یعنی ''بدعت علمی''۔ حاصل یہ کہ

بدعت علمی کے علمبرداروں کا نقصان تو پھیلاؤ میں کم رہا۔کیونکہ دقیق اور عالمانہ مسائل سے اس کا تعلق تھا اور علماء کے طبقہ میں ایسے لوگوں کا فقدان نہ تھا جو تجزیہ وتنقید کے ذریعہ سے غلط اور صحیح، اسلامی اور غیر اسلامی کو الگ الگ کر کے نہ دکھا سکیں، لیکن مبتدعین کا نقصان چڑھتے ہوئے دریا کی طرح پھیلا۔کیونکہ عوام بھیڑ چال کے عادی ہوتے ہیں اور عقیدت ونیاز مندی ان کے معمولی شعور وفہم پر پوری طرح چھا جاتی ہے۔جس کے بعد دلیل اور علم کی قوت بہت مشکل سے اور بہت دیر میں ان پر کارگر ہوتی ہے!

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ عملاً بدعات کی کثرت اور بدعات کی تعلیم دینے والی کتابوں کی اشاعت نے اسلامی قوانین میں اس طرح بدعات کو آمیز کر دیا کہ صحیح اور غلط کا جدا کرنا محال ہوگیا۔یہ اس لیے نہیں ہوا کہ قرآن وحدیث کو مسخ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی، اور سلف صالحین نے علم وفن اور اجتہاد وتفقہ کا جو آئینہ خلف کو دیا ہے وہ بے غبار اور بہت مضبوط تھا۔مگر اس آئینہ سے فائدہ اٹھانا اور قرآن وسنت کو معیار ومستدل بنانا گنے چنے خواص ہی کا کام ہوسکتا ہے۔باقی امت بدعت کا ہدف بن گئی۔جنہیں دین کی کچھ فہم تھی وہ کم بگڑے، جو نافہم تھے وہ زیادہ بگڑ گئے۔اس بگاڑ کا ایک نقصان عظیم تو یہ ہوا کہ اسلام کی تحریک اور دعوت اقامت دین انبیاء علیہم السلام وصحابہ رضی اللہ عنہم کی راہ عزیمت پر چلنے کے بجائے ان غلط راہوں پر مڑ گئی جن میں رہبانیت، تقشف، اور لاحاصل شور وغوغا اور بے روح وعبث رسوم ورواج کی بہتات ہے۔بدعتوں نے سنتوں کو نگل لیا، ریا نے اخلاص کو کھالیا۔دین میدان عزیمت وجہاد سے سمٹ کر بارگاہوں، خانقاہوں، قبروں اور ''محفلوں'' میں آگیا!

دوسرا عظیم نقصان یہ ہوا کہ غیر مسلم اقوام کی رائے اسلام کے بارے میں بگڑتی چلی گئی۔اور جو کشش اس کے اصول واحکام میں تھی اور جس کی وجہ سے یہ حیرت انگیز رفتار سے پھیلا تھا، وہ نہ صرف معطل ہوگئی بلکہ اس کی جگہ بدنمائی اور کثافت نے لے لی۔ظاہر ہے کہ دیگر اقوام کے عوام کو اس کی فرصت اور اہلیت کہاں کہ وہ براہ راست قرآن وسنت اور دین کی مستند کتابوں سے صحیح اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں؟ اور کیوں کریں؟ دنیا کا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے کہ کسی قوم کے ذہنی اعتقادات واصول کا اندازہ وہ اس کے ان اعمال وافعال سے لگاتی ہے، جو اس میں بطور مراسم مذہبی رواج پائے ہوئے ہوں اور اعتقادات واصول ہوتے بھی حقیقت میں اسی لیے ہیں کہ اعمال وافعال میں ان کا ظہور ہو۔دنیا نے جب ''عرسوں، قوالیوں'' قبر پرستیوں، درگاہ سامانیوں اور اسی نوع کی متعدد چیزوں کو مسلمانوں میں دینی حیثیت سے رائج پایا تو گمان کرلیا کہ یہ سب اسلام ہی کے احکام واصول کا ظہور ہے اور اس غلط گمان کو تقویت اس

نے دی کہ جو لوگ ان اعمال میں مبتلا تھے وہ زبان و بیان سے نمائندگی اسلام کے مدعی بھی تھے اور ان میں سے بہت سوں کا ظاہر بھی ایسا تھا کہ سطح بین نگاہیں انہیں ترجمان اسلام سمجھنے پر قدرتاً مجبور تھیں۔ چنانچہ نفس اسلام کے بارے میں دنیا کو غلط فہمیاں ہوئیں۔ اور وہ توحید خالص اور تعلیم مصفا جو اسلام میں وجہ کشش تھی، شرک و بدعت کی بدنمائی اور کثافت میں دب گئی۔ اسلام کا شکوہ، وقار، تقدس اور جاذبیت مجروح ہو گئی۔

میں مانتا ہوں کہ اسلام کے پھیلاؤ اور اشاعت کے رک جانے میں بڑا ہاتھ خود مسلمانوں کی بداعمالیوں اور غلط کوشیوں کا ہے۔ لیکن جو بداعمالیاں مسلمانوں نے دین کی آڑ لے کر نہیں بلکہ خالص دنیا دارانہ طور پر کیں، ان سے دیگر اقوام کی رائے خود مسلمانوں کے حق میں چاہے کتنی ہی خراب ہو گئی ہو، مگر نفس اسلام کے متعلق نظری طور پر انہیں بدگمانیاں نہیں ہوئیں۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ یہ مذہب کی برائیاں نہیں، اہل مذہب کے اپنے کرتوت ہیں۔ ان برائیوں کا ذمہ دار مذہب نہیں، خود اہل مذہب ہیں۔ اس کے برخلاف دین کے نام پر عبادت و طاعت کے رنگ میں کی جانے والی برائیوں نے انہیں نفس اسلام ہی سے بدگمان کیا اور اسلام سے ان کی دوری صرف تعصب اور جذباتی عناد کے تحت نہیں رہی بلکہ اسے عقلی و شعوری دلائل بھی مل گئے!

دیگر اقوام کے علاوہ خود مسلمانوں ہی کے عقائد و نظریات کو بدعات نے بایں طور فاسد کیا کہ بیچارے کم علم عوام کے مخلص افراد اگر خلوص اور ایمانداری کے ساتھ احکام اسلامی کو جامہ عمل پہنانے کی طرف مائل ہوئے تو ان کی استعداد کے مطابق جو دینی لٹریچر ان کے ہاتھ میں آیا اس میں پہلے ہی سے صحیح کے ساتھ غلط اور اسلام کے ساتھ بدعت کی آمیزش تھی، اور جو وعظ محراب و منبر سے انہیں سنائے گئے ان میں بھی بدعت کی تعلیم کسی نہ کسی درجہ میں موجود تھی۔ اب ان بے چاروں کے پاس یہ قابلیت کہاں کہ تجزیہ و تنقیح کر کے اسلام و غیر اسلام کو جدا کر سکیں۔ بڑی معصومیت و خلوص کے ساتھ رطب و یابس کو قبول کرتے چلے گئے اور بدعت کا زہر ان کے ذہن و قلب، مزاج اور اعمال و افعال میں پھیلتا چلا گیا!

ریا کے بارے میں آپ جان چکے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا اندراج شرک کے خانہ میں کیا ہے۔ بدعت اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے دکھاوے اور نمود اور گرمی محفل کو پسند کرتی ہے۔ یہ چیزیں ریا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ گویا بدعت کے خمیر ہی میں شرک ہے اور ابتداء میں شرکِ خفی ہوتے ہوئے یہ بہت جلد شرکِ جلی کی منزل میں پہنچ لیتی ہے۔ شجر بدعت کے برگ و بار دیکھئے! صورت اور سیرت دونوں

اعتبار سے ان پر شرک کی تعریف صادق نظر آئے گی!

منکرات ومحرمات شرعیہ کا مرتکب مسلمان تو ممکن ہے کہ کسی وقت توبہ واستغفار کی طرف مائل ہو جائے کیونکہ وہ بہرحال گناہ کو گناہ ہی سمجھ رہا ہے اور اس کے اعتقادات مسخ وفاسد نہیں ہوئے، مگر بدعت پسندوں کے لیے توبہ کا امکان بھی کم ہے۔ کیونکہ وہ جس گمراہی میں مبتلا ہیں وہ تو ان کی نظر میں عین ہدایت ہے اور ان کے اعتقادات مسخ وفاسد ہو چکے ہیں!

اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا، وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعِ الْھُدٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَآءِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ!

''الوسیلہ'' کا حقیقی مفہوم

محترمہ عطیہ خلیل عرب

یہ انتہائی غمناک، المناک وافسوسناک حقیقت ہے کہ وہ مسلمان جو توحید ورسالت پر یقین رکھتے ہیں، انہی میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو مشرکانہ رسوم اور بدعات کے اتنے خوگر ہو گئے ہیں کہ اپنی اس جہالت وضلالت ہی کو ''دین'' سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لیے نہ تو وہ حق کی جستجو کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور نہ انہیں توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے! العیاذ باللہ!

عوام کی اس جہالت اور گمراہی کے بہت کچھ ذمہ دار وہ مدعیان علم وخبر ہیں، جو ''کتاب اللہ'' کی آیات میں من گھڑت تاویلیں کرنے اور من بھاتا مطلب نکالنے تک سے نہیں چوکتے!

عوام کو سب سے زیادہ فریب:

﴿...... وَابْتَغُوٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ......الخ﴾

کے نام پر دیا جاتا ہے، کہ یہ دیکھو! اللہ تعالیٰ قرآن میں حکم دیتا ہے کہ ''وسیلہ تلاش کرو''۔ پس انبیاء علیہم السلام، شہداء اور اولیاء کے ''وسیلہ'' کے بغیر اللہ تعالیٰ تک رسائی ہی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی ''وسیلہ'' کا عقیدہ پھیل کر قبروں پر جا کر مرادیں مانگنے، ان پر چادر چڑھانے، طواف کرنے، ''اولیاء اللہ'' کو حاضر وناظر جاننے، ان کے ناموں کی دہائی دینے اور انہیں مصیبت کے وقت استمداد کے لیے پکارنے'' کی مشرکانہ صورتیں اختیار کر لیتا ہے!

اس مضمون میں اسی آیت کی شرح وتفسیر مقصود ہے، تاکہ اہل بدعت نے جس آیت کو سب سے زیادہ اپنی ہوائے نفس کی کمیں گاہ بنا رکھا ہے، اس کی معنوی تحریف اور غلط استدلال کا تارو پود بکھر جائے اور لوگ سمجھ لیں کہ اس آیت کریمہ کا اصل منشاء اور مقصود ومدعا کیا ہے!

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ......الخ﴾ (المائدہ ۵: آیت ۳۵)

اس آیت سے اہل بدعت وبدعقیدہ لوگ پیر پرستی اور غیر اللہ کو اللہ تعالیٰ تک رسائی کا ذریعہ بنانے کے لیے بزعم خود وجہ جواز پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں یہاں اور جہاں بھی ''الوسیلہ'' استعمال

ہوا ہے، اس سے مراد یہ نہیں جو یہ لوگ لیتے ہیں!

پہلے یہ دیکھنا ہے کہ "الوسیلہ" کے لغوی معانی کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب امام راغب اصفہانی کی لغت ہے۔ "مفردات راغب اصفہانی" میں اس لفظ "الوسیلہ" کی لغوی تشریح ملاحظہ ہو:

(وسل): الوسيلة التوصل الى الشيئى برغبة وهى اخص من الوصيلة لتضنها لمعنى الرغبة قال الله تعالىٰ وابتغوا اليه الوسيله وحقيقة الوسيلة الى الله تعالىٰ، مراعاة سبيله بالعلم والعبادة وتحرى مكارم الشريعة وهى كالقربة والواسل الى الله الراغب اليه

"کسی شئے تک رغبت سے پہنچنا اور یہ وسیلہ (بالصاد) سے صرف بمعنٰی رغبت کے خصوصیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ ابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ سے مراد صراط مستقیم پر علم، عبادت اور مکارم شریعت (اعمال صالحہ) کے ساتھ گامزن رہنا ہے۔ اس لیے قربت کا معنٰی صحیح ہے اور "الواسل" کا معنٰی "اللہ تعالیٰ سے رغبت وقرب رکھنے والا" ہے!

مفسر گرامی علامہ محمد بن جریر الطبری فرماتے ہیں:

(وَ ابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ) يقول اطلبوا القربة اليه بالعمل بما يرضيه والوسيلة الفعيلة عن قول قائل توسلت اليه بكذا بمعنٰى تقربت اليه

"اللہ سے ایسے اعمال کے ساتھ تقرب چاہو جو اس کی خوشنودی کا باعث ہوں۔ "الوسیلہ" علیٰ وزن "فعیلہ" ہے۔ مثلاً کوئی کہے کہ میں اس سے قریب ہوا تو وہ توسل تقرب ہی کے معنٰی میں استعمال ہوگا۔ اس کی دلیل میں یہ شعر ہے۔

اذا غفل الواشون عدنا لوصلنا

فعاد التصافى بيننا والوسائل

"چغلخوروں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہم ملنے کا سامان کرلیں گے اور پھر ہمارے درمیان تقرب واخلاص لوٹ آئے گا!"

آگے لکھتے ہیں:

وبمعنى الذى قلنا قال بعض اهل التاويل ذكر من قال ذالک. حدثنا بشار،

سفیان عن ابی وائل ابتغوا الیه الوسیله القربة فی الاعمال وحدثنی سفیان ابی طلحة، عطاء الآیة. فی المسئلة القربة وعن قتادة ای تقربوا الیه بطاعة والعمل بمایرضیه عن ابی حذیفة قال حدثنا مشبل عن ابن ابی نجیح عن مجاهد وابتغوا الیه الوسیلة قال القربة

''ہماری طرح بعض اہل تاویل نے بھی یہی معانی مراد لیے ہیں۔ چنانچہ بشار، سفیان سے اور سفیان ابووائل سے راوی ہیں کہ ''الوسیلہ'' سے مراد قربت ہے اعمال صالحہ سے۔ اور اسی طرح سفیان ابوطلحہ سے اور وہ عطا سے راوی ہیں کہ اس آیت میں ''وسیلہ'' کے معانی قربت کے ہیں! اور قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے، آپ فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی خوشنودی کے کام کر کے اس سے تقرب حاصل کرو اور ابوحذیفہ، مشبل سے اور وہ ابن ابی نجیح سے اور مجاہد سے ''الوسیلہ'' کے معانی ''القربت'' ہی روایت کیے ہیں۔'' (تفسیر ابن جریر الطبری، ص۵۵)

تفسیر ابن کثیر:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ......الخ﴾

''ممنوعات و مکروہات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے نہیں۔ الوسیلہ علیٰ وزن فعیلہ ہے۔ گویا توسلت الیہ ''میں اس سے قریب ہوا'' بمعنیٰ تقرب۔ اس لیے کہ ''الوسیلہ'' کا معنیٰ ''القربۃ'' ہے اور اللہ سے قربت ایسی نعمت ہے جسے ضرور مانگنا چاہیے۔ اور اسی طرح ابووائل، حسن، مجاہد، قتادہ سے مروی ہے اور السدی اور ابن زید، ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطاء روایت کرتے ہیں کہ الوسیلہ سے مراد اعمال صالحہ سے قرب الٰہی حاصل کرنا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ الوسیلہ کے اس معنیٰ میں ان ائمہ مفسرین کو اتفاق ہے، کسی ایک کو بھی اس تفسیر میں اختلاف نہیں رضی اللہ عنہم ورحمہم اللہ تعالیٰ! اس کے ساتھ ساتھ الوسیلہ جنت میں ایک اعلیٰ منزل بھی ہے جو صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے مخصوص ہے۔ اذان کے بعد جو دعا پڑھنے کا حکم ہے، اس دعا میں آت محمدن الوسیلة سے مراد جنت کا یہی درجہ ہے۔''

تفسیر کبیر علامہ فخرالدین رازی میں ہے: ﴿وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ......الخ﴾ ای القربة بالعمل یعنی ''الوسیلہ سے مراد عمل سے قربت حاصل کرنا ہے!''

علامہ ابن جریر الطبری رحمہ اللہ اور علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ و علامہ رازی کی طرح سلف و خلف کے تمام

مفسرین ''الوسیلہ'' کے اس معنٰی پر اتفاق رکھتے ہیں کہ ''الوسیلہ'' سے مراد اعمال صالحہ کے ذریعہ سے تقرب الٰہی حاصل کرنا ہے!

ائمہ سلف میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے خاص طور پر مقالہ (الواسطة بين الخلق والحق) اپنے دیگر رسائل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔ اس مقالہ کے تحریر کرنے کا سبب یہی تھا کہ دو شخص آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان کوئی وسیلہ یا واسطہ ضروری ہے اور دوسرا اس کے خلاف تھا۔ چنانچہ یہ مسئلہ امام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے جواب کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

''اگر اس شخص کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان کوئی واسطہ ضرور ہونا چاہیے، جس سے بندوں کو یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کن اعمال سے خوش ہوتا ہے اور کن اعمال کو پسند فرما کر اپنے فرمانبردار بندوں پر انعام و رحمت کی بارش کرتا ہے اور کن نافرمانیوں اور بداعمالیوں سے بندے عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات کو کیا کیا نام زیبا اور شایان شان ہیں۔ ان تمام امور کی معرفت ادراک سے عقل انسانی عاجز و درماندہ ہے، اس لیے کسی ذریعہ یا واسطہ کی ضرورت پیش آتی ہے، چنانچہ اس قادر مطلق نے ہر دور میں اپنے رسول یعنی فرستادہ بندے دنیا میں بھیجے اور اس کے رسولوں پر ایمان لا کر عمل کرنے والے بلاشبہ راہ ہدایت پر ہیں۔''

''دوسرے سائل کا یہ سوال کہ آیا کسی غوث، قطب اور فرد کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ تک رسائی ممکن ہے؟ تو یہ چیز اب عام ہو گئی ہے۔ بعض لوگ اس طرح بے بنیاد اور باطل امور کو اسلام کا جزو بنا رہے ہیں۔ بعض لوگ غوث کو ایسی طاقت مانتے ہیں جس کی وساطت سے امداد خلائق ہوتی ہے اور یہ وہی غلو ہے جس نے ابن مریم کو ابن اللہ بنا دیا۔ اور اس غلو سے علی رضی اللہ عنہ کو بھی نصیریوں نے یزدانی طاقتیں دے رکھی ہیں۔ نعوذ باللہ! یہ سراسر کفر ہے۔''

اور جس نے توسل کے ان دو معانی (یعنی اعمال صالحہ اور نبی کریم ﷺ کا قیامت کے دن وسیلہ شفاعت) سے انکار کیا، وہ کافر ہے۔ (ترجمہ میں تفصیل کر دی گئی ہے)

''جس نے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کسی کو ذریعہ بنا کر اس پر بھروسہ کیا، اس کو پکارا اور اس سے حاجت طلب کی تو اس نے بالاجماع کفر کیا۔'' (الجواب الکافی)

قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی مرضی کے مطابق اعمال سے اس کا قرب

حاصل کرو۔ ابن زید رضی اللہ عنہ نے یہی آیت تلاوت فرمائی تھی! (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

"قرب الٰہی، اخلاص، طاعت اور ایسے اعمال سے مانگتے ہیں جن سے وہ راضی اور خوش ہو نہ کہ ایسے اعمال جن سے اس نے منع فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی وحدانیت کا اقرار ہے کہ اس نے اس پیغام کے ساتھ اپنے انبیاء اور رسولوں علیہم السلام کو بھیجا، اس کا ان کو حکم دیا اور یہی وہ ذریعہ ہے جو ان کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرتا ہے۔ توسل کی ایک شکل یہ ہے کہ اس کو اس کے ناموں اور صفات کے وسیلہ سے پکارو۔ یہی اس نے حکم دیا ہے اور جیسا کہ بعض ادعیہ ماثورہ میں ہے کہ **اللھم انی اسئلک بان لک الحمد۔** اس دعا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی تعریف کا وسیلہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ سے قرب کا ذریعہ وہ نیک اعمال ہیں جو خالص اللہ کے لیے کیے گئے ہوں اور جن میں شرک کا شائبہ نہ ہو!

اللہ تعالیٰ کا قرب ان اعمال سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، جس سے وہ راضی اور خوش ہو نہ کہ جن سے اللہ تعالیٰ منع فرماتا ہو۔ خاص طور پر شرک، جس سے اس نے اپنی ذات کو پاک رکھا ہے سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔

نہ صرف مفسرین وائمہ کرام بلکہ مزاج شناس رسول ﷺ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی قرآن کریم کے معانی میں انتہائی احتیاط اور باریک بینی سے کام لیتے تھے۔ اس کے باوجود فرماتے ہیں: "کون سا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کون سی زمین مجھے پناہ دے گی اگر میں کتاب اللہ سے وہ معنی بیان کروں جو میں نہیں جانتا۔" اور ان اہل بدعت کی یہ جرأت کہ کتاب اللہ کو اپنی خواہشات کے تابع بنانا چاہتے ہیں!

تفاسیر اور اقوال ائمہ سے یہ بات آفتاب کی طرح روشن اور ثابت ہے کہ الوسیلہ کا جو لفظ قرآن پاک میں آیا ہے، اس سے مراد "اعمال صالحہ" کے ذریعہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب حاصل کر کے اس کی رحمتوں کا مستحق بننا ہے۔ اہل بدعت الوسیلہ سے جو یہ مراد لیتے ہیں کہ کسی ولی، قطب اور پیر کو قرب الٰہی کا ذریعہ بنایا جائے یا مشکل کشا اور حاجت روا مانا جائے، تو یہ ان کی اختراع نفس اور بدترین قسم کی "تفسیر بالرائے" ہے۔ جس سے ایک طرف تو اس آیت کی معنوی تحریف ہوتی ہے اور دوسری طرف شرک وبدعت کے لیے میدان ہموار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان فتنوں سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے، آمین!

"الوسیلہ" قرآن کی روشنی میں

اہل بدعت ایک طرف اگر صرف اس ایک آیت ﴿وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ ..... الخ﴾ کا بزعم خو.

سہارا لے کر اور قرآن کریم میں معنوی تحریف کرنے کے بعد کسی ولی، قطب یا شہید کی ذات مراد لیتے ہیں، جس سے لامحالہ شرک فی الذات والصفات الہ العالمین، قبر پرستی و پیر پرستی کی راہیں کھلتی ہیں اور غیر اللہ کی نذر و نیاز، ''عرس''، مزامیر اور مشرکانہ اشعار سے محفل سماع کا موقع ملتا ہے تو دوسری طرف سارے کا سارا قرآن کریم ہے، جس کی شان نزول ہی شرک و بدعات کا قلع قمع کرنا اور بندوں کا صرف اللہ وحدہٗ لاشریک سے عابد و معبود کی حیثیت سے رشتہ قائم کرنا ہے۔ بعثت نبوی ہے کہ آپ ﷺ کی ساری زندگی شرک و بدعات کے خلاف دعوت و تبلیغ سے، اقوال و اعمال سے، سیرت و کردار سے جہاد میں گزری---﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ......الخ﴾ (النحل ١٦: آیت ٣٦)

''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ ''اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔''......الخ

اس ''طاغوت'' سے مراد صرف پتھر کے صنم ہی نہیں بلکہ ہر وہ شئے یا ذات ہے جس کو رب العالمین کے سوا معبود مان لیا گیا ہو!

[اس آیت کا معنٰی یہ ہے: ''ہم نے ہر اُمت میں رسول بھیجے (جن کو حکم یہ تھا کہ وہ خود بھی اس ربانی حکم کی پابندی کریں اور دوسروں کو بھی یہی دعوت دیں کہ) صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کریں اور طاغوت کی بندگی سے بچیں۔''---ع۔ ش۔ ش]

کیا ''الوسیلہ'' سے اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ توحید کے پرستار ایک بار پھر ہزار ہا ''پرستیوں'' میں مبتلا ہو گئے۔ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں سے خراج وصول کرنے والے ''بزرگوں'' کی قبروں کی آمدنی پر جی رہے ہیں، لات و منات کی جگہ مقبروں اور تعزیوں نے لے لی ہے اور ان عقائد کے حاملوں کے اعمال و کردار میں، اقوال و گفتار میں زمانہ جاہلیت کے مشرکین سے کس درجہ شرمناک مشابہت پائی جاتی ہے!

زمانہ جاہلیت کے مشرکین بھی ذات باری تعالیٰ کے منکر نہ تھے ﴿وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ......الخ﴾ (الزمر ٣٩: آیت ٣٨)

''ان لوگوں سے اگر تم پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔''......الخ

اور وہ بتوں کو قرب الٰہی کا وسیلہ بنا کر ان کی پرستش کرتے تھے۔ ﴿......مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا

اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی ۭ ......الخ﴾

(ترجمہ) ''(وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ تک ہماری رسائی کرادیں۔''

موجودہ دور میں قبر پرستی اور پیر پرستی کے لیے اہل بدعت بھی یہی غرض بتاتے ہیں۔

اہل بدعت کی اس غلط فہمی کا ازالہ تو خود قرآن کریم ہی کی آیات سے ہوجاتا ہے:

الف ﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗٓ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَآئِہِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَھُمْ اَعْدَآءً وَّکَانُوْا بِعِبَادَتِہِمْ کٰفِرِیْنَ﴾ (الاحقاف ۴۶: آیت ۵،۶)

''اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی ایسے کو پکارے جو اس کی پکار کو روز قیامت تک نہ پہنچے اور وہ ان کی پکار کو جانتے بھی نہیں۔ اور جب قیامت کے دن لوگ جمع ہوں گے، تو جن کی وہ پوجا کرتے تھے ان کے وہ دشمن ہوں گے!''

ب ﴿قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِہِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ ......الخ﴾ (الرعد ۱۳: آیت ۱۶)

''کہو! پھر کیا تم نے اس (یعنی اللہ تعالیٰ) کے سوا ایسے حمایتی بنا رکھے ہیں جو اپنے بھلے برے کے بھی مالک نہیں!''

ج ﴿لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَھُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیْہِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاہُ وَمَا ھُوَ بِبَالِغِہٖ ۭ وَمَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ﴾ (الرعد ۱۳: آیت ۱۴)

''اسی کو پکارنا سچ ہے، اور جن لوگوں کو کہ پکارتے ہیں اس کے سوا، وہ ان کے کچھ بھی کام نہیں آتے! جیسے کسی نے اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے کہ اس کے منہ تک آ پہنچے اور وہ اس تک کبھی نہ پہنچے گا۔ کافروں کا جتنا پکارنا ہے وہ سب گمراہی ہے!''

د ﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ فَلَا یَمْلِکُوْنَ کَشْفَ الضُّرِّ عَنْکُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا ۝ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّہِمُ الْوَسِیْلَۃَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَہٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَہٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا﴾ (الاسراء ۱۷: آیت ۵۶،۵۷)

''ان سے کہو: ''پکار دیکھو ان معبودوں کو جن کو تم اللہ کے سوا (اپنا کارساز) سمجھتے ہو۔ وہ کسی تکلیف کو تم سے نہ ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔'' جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہو جائے! اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے لائق ہے۔''

الوسیلہ کے اس غلط مفہوم کے خلاف سارا قرآن کریم موجود ہے! بفرض محال اگر ''الوسیلہ'' کا یہی مفہوم جائز، روا اور حقیقی ہوتا تو معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا کوئی شخص بھی رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں کسی ولی، ''قطب''، ''غوث'' کی ذات کو افضل وارفع قرار نہیں دے گا اور نہ کوئی انسان اللہ رب العزت کے نزدیک آپ ﷺ سے بڑھ کر معزز و مقرب اور محبوب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا دنیا میں یہ مرتبۂ بلند اگر کسی کو ملتا تو وہ صرف محمد بن عبداللہ ﷺ ہی کی ذات گرامی ہوتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

س ﴿قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ○ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا﴾ (الجن ۷۲: آیت ۲۱،۲۲)

''تو کہہ میرے اختیار میں نہیں تمہارا برا اور نہ راہ پر لانا، تو کہہ مجھ کو نہ بچائے گا اللہ کے ہاتھ سے کوئی اور نہ پاؤں گا اس کے سوا کہیں سرک رہنے کو جگہ!''

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَکٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ...... الخ﴾ (الانعام ۶: آیت ۵۰)

''میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس غیب کے خزانے ہیں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو اس کی اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے!''

﴿لَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ...... الخ﴾ (الاعراف ۷: آیت ۱۸۸)

''اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی برائی نہ پہنچتی!''

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ (الکہف ۱۸: آیت ۱۱۰)

''کہہ دو میں بھی ایک آدمی ہوں تم جیسا۔ حکم آتا ہے مجھ کو کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے۔ تو پھر جس

کو اپنے رب سے ملنے کی امید ہو، سو وہ نیک کام کرے، اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔'' (کہف۔ آخری رکوع)

ان آیات کی روشنی میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات محبوب رب العالمین کو نفع ونقصان پہنچانے کی قدرت حاصل نہیں (آخری آیت میں آپ ﷺ کی بشریت، توحید باری تعالیٰ کی دعوت، اور اعمال صالحہ کی تلقین وشرک فی العبادت سے پرہیز کا اظہار ہے) تو پھر کسی پیر، ''قطب'' اور ولی کی کیا ہستی ہے جو کسی کی مشکل کشائی یا حاجت روائی کر سکیں!

تقریب ومحبوبیت، افضلیت واکملیت کے باوجود نبی ﷺ کے عمل وخوف کا یہ عالم، احتیاط وفروتنی کی یہ حالت کہ اگر کہیں کسی مقام پر بھی ربوبیت سے رسالت کی حدود کا ٹکراؤ دیکھ پائیں تو خشیت الٰہی سے لرز کر فرمائیں:

ایک شخص کے یہ کہنے پر کہ ''جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں'' نبی ﷺ نے عتاب کا اظہار فرمایا اور کہا کہ کیا تم نے مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دیا؟ یوں مت کہو کہ ''جو اللہ اور محمد ﷺ چاہے'' بلکہ یوں کہو کہ ''جو اللہ تعالیٰ تنہا چاہے!''

ایک متوازن سے متوازن انسان بھی اپنی تعریف سن کر خوش ضرور ہوتا ہے خواہ زبان سے اظہار نہ کرے، لیکن رحمۃ اللعالمین ﷺ کا یہ تقویٰ کہ اگر آپ ﷺ کو جان نثاران توحید انت سیدنا (یعنی آپ ہمارے سردار ہیں) کہیں تو فرمائیں: بل السید ھو اللہ (یعنی سیّد تو اللہ کی ذات ہے)۔ گویا رسالت کی حد تک تو اپنی عظمت وتعریف برداشت ہے، ورنہ شرک فی الصفات کے خوف سے اتنا غلو بھی گوارا نہیں!

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ جس طرح نصاریٰ (عیسائیوں) نے مسیح ابن مریم (علیہما السلام) کو بڑھا دیا۔ میں تو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔''

(صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث ۳۴۴۵، ۶۸۳۰)

''تم کو کچھ بھی مانگنا ہو تو اللہ تعالیٰ ہی سے مانگو اور جب بھی مدد چاہنا ہو تو اللہ تعالیٰ ہی سے مدد چاہو!''

(ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، حدیث ۲۵۱۶ عن عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حدیث حسن صحیح)

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی مشکل کشا یا حاجت روا سمجھنا اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں اس کو شریک کرنا ہے۔ اور ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾[1] کے ساتھ ساتھ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن

---

[1] لقمان ۳۱: آیت ۱۳ — (ترجمہ) ''شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔''

یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذَالِکَ﴾[1] ایک اٹل فیصلہ ربانی ہے۔اس ذنب لایغفر سے بچنے کے لیے شرک کی بعید تر مشابہت سے بھی اجتناب کرنا چاہیے کہ یہی ایمان اور توحید کا تقاضا ہے!

اسی طرح اگر کسی کے ''مزار'' پر عرس منانے، چراغاں کرنے اور نذر و نیاز کی اجازت ہوتی، تو اس کے لیے بھی صرف نبی اکرم ﷺ کی قبر ہو سکتی تھی۔ لیکن چونکہ فتنہ قبور کی خطرناکی اور غلو فی الانبیاء والصالحین کے نتائج نبی ﷺ کے پیش نظر تھے، اس لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آپ ﷺ نے تاکید فرمائی کہ ''میری قبر کو عید (یعنی میلہ گاہ) نہ بنانا!''

انہی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی: اللھم لاتجعل قبری وثنا یعبد ''الٰہی! میری قبر کو بت نہ بنانا کہ اس کی پرستش کی جائے۔''

''وثن'' کا معنوی اطلاق ہر اس شئے پر ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا معبود بنا لیا جائے۔ نبی ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

''خبردار! غلو سے ہمیشہ بچنا۔ اس لیے کہ تم سے قبل جو لوگ تھے وہ اس غلو سے تباہ کیے گئے!''

آج نافرمانی کا یہ عالم ہے کہ ہماری نظروں سے ایسے اشعار بھی گزرتے ہیں جن کی نقل سے بھی ہاتھ لرزتے ہیں ؎

ہمارے سرور عالم کا رتبہ کوئی کیا جانے
خدا سے ملنا جو چاہے محمد ﷺ کو خدا جانے

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

نعوذ باللہ من ذالک! اس مشرکانہ ذہنیت کے لوگوں کی اس مبالغہ آمیزی سے خود نبی کریم ﷺ کی روح پاک کو کس قدر اذیت ہوگی۔ ﴿وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِیْنًا﴾[2] اور ((لاتطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم المسیح)) کی نافرمانی کے لیے اس سے بڑی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس غلو فی الانبیاء نے عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ اور عزیر علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ کا

---

[1] النساء۴: آیت ۴۸ ــــ (ترجمہ) ''اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے......الخ''

[2] الاحزاب۳۳: آیت ۳۶ ــــ (ترجمہ) ''......اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔''

بیٹا بنا کر نصاریٰ اور یہود کو قہر الٰہی کی نذر کیا اور یہی غلو مسلمانوں کو بھی تباہی کے گڑھے کی طرف لے جا رہا ہے!

''الوسیلہ'' کا یہی مفہوم اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی لیا کرتے تو وہ بھی تقویٰ، صالحیت، عبادات سب چھوڑ کر نبی کریم ہی کی ذات گرامی کو قرب الٰہی کا ذریعہ بنا لیتے اور روضہ نبوی کی مجاوری ان کا پیشہ ہوتا۔ لیکن آثار صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ ان محترم ہستیوں کے تقویٰ اور اتباع سنت پر سختی کا یہ عالم تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے وہ درخت ہی کٹوا دیا جس کے سایہ میں رسول اللہ ﷺ نے بیعت صلح حدیبیہ لی تھی۔ اس میں محض شرک کا خوف کارفرما تھا۔ اس لیے کہ بعض لوگ قصداً اس درخت کے سایہ میں نماز پڑھنے جانے لگے تھے!

معرور بن سوید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے ایک بار عمر (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ مکہ کے راستہ میں صبح کی نماز پڑھی۔ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک طرف جا رہے ہیں۔ دریافت فرمایا کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ عرض کیا گیا: ''یا امیر المومنین! یہاں ایک مسجد ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی۔ یہ لوگ بھی وہاں نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔'' آپ نے فرمایا:

''تم سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہوئے کہ اپنے انبیاء کے آثار کی بھی اتباع کرتے تھے حتیٰ کہ ان کو عبادت گاہ (کلیسا اور معبد یہود) بنا کر چھوڑا!''

ایک بار عمر رضی اللہ عنہ ہی نے بھرے مجمع میں دعا فرمائی:

''الٰہی! پہلے جب قحط پڑتا تھا تو ہم اپنے نبی کے توسل سے پانی مانگتے تھے اور تو ہمیں سیراب کر دیا کرتا تھا۔ اب ہم اپنے نبی کے عم محترم (عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ) کے توسل سے پانی مانگتے ہیں۔ تو انہیں سیراب کر!'' چنانچہ بارش ہوگئی۔'' (صحیح بخاری، کتاب الاستقاء، حدیث ۱۰۱۰)

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کا وسیلہ لیا، مگر آپ ﷺ کی وفات کے بعد نہیں لیا۔ اس کی تائید میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ سے کسی کا وسیلہ لینا جائز نہیں۔ اس کو اس کے نام و صفات سے ہی پکارو۔ بلکہ یہ بھی درست نہیں کہ ''الٰہی! بحق فلاں نبی یا فلاں فرشتہ میری حاجت روائی کر۔'' (دُرِ مختار)

خانوادۂ نبوی ﷺ کے چشم و چراغ زین العابدین (حسن بن حسین رضی اللہ عنہ) نے ایک شخص کو دعا وسلام کی غرض سے قبر نبوی ﷺ کے پاس جانے سے منع فرمایا اور کہا:

''مجھ سے میرے پدر بزرگوار نے جد محترم سے روایت کی ہوئی حدیث بیان کی ہے۔ کیا میں تمہیں نہ بتادوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری قبر کو میلہ گاہ نہ بنانا اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنانا۔ تمہارا درود وسلام تم جہاں بھی رہو، مجھے پہنچتا رہے گا!''

دراصل زمانہ جاہلیت میں غلو فی الانبیاء والصالحین نے بت پرستی اور قبر پرستی عام کی تھی اور یہی غلو فی الاولیاء والصالحین آج بھی بعض مسلمانوں کو گمراہی کی طرف لے جارہا ہے!

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے شرک فی الذات والصفات رب العالمین کو حرام قرار دیا ہے۔ ان بزرگوں نے ہمیشہ قرآن وسنت کو اپنا لائحہ عمل بنایا اور رد شرک وبدعت کے ساتھ توحید کی علمبرداری کرتے ہوئے ان کی ساری کی ساری زندگیاں عبادت، تقویٰ اور ریاضت سے تزکیہ نفس میں گزر گئیں۔ (رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین)

''الوسیلہ'' کا غلط مفہوم لے کر ان مشرکانہ رسوم کو اولیاء اللہ کی خوشنودی کے لیے ادا کرنا ان ہستیوں پر سراسر تہمت جوڑنا ہے۔ اس لغو سرائی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ کہ

به گرداب بلا افتاد کشتی
مدد کن یا معین الدین چشتی
حقیقت میں دیکھو تو خواجہ خدا ہے
ہمیں در پہ خواجہ کے سجدہ روا ہے
شیئاً للہ چوں گدائے مستمند
المدد خواہم زخواجہ نقشبند!

نعوذ باللہ من ھذہ الھفوات ونستغفرہٗ!

قرآن پاک کی یہ آیت کس طرح دوٹوک فیصلہ کرتی ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ...... الخ﴾

(البقرہ۲: آیت ۱۸۶)

''اے پیغمبر! جب میرا کوئی بندہ تم سے میرے متعلق دریافت کرے کہ (وہ کیوں کر مجھ تک رسائی حاصل کرسکتا ہے) تو تم اس کو بتادو کہ میں تو اس کے پاس ہی ہوں (دور نہیں کہ رسائی کے لیے کسی ذریعہ اور مشقت کی ضرورت ہو) اور میں اس کی پکار سن کر قبول کرتا ہوں۔''

اس آیت کے بعد غیر اللہ سے استمداد، استعانت اور استغاثہ کے لیے کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ یہ وہ اقرار ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان خالق و مخلوق اور حاکم و محکوم کا رشتہ قائم کر دیتا ہے۔ یہ وہ تعلق ہے جو ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ [1]﴾ کہتے ہی صرف ایک ذات کو استعانت و استعباد کا مستحق اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے غیر اللہ کے خوف اور بندگی کا طوق انسانیت کی گردن سے اتار دیتا ہے، اور اس حقیقت کے ادراک کے بعد ہی ﴿......اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ [2]﴾ کا صحیح لطف آتا ہے!

اس سے بڑھ کر ناشکری اور ظلم کیا ہوگا کہ اس قادر مطلق کے ساتھ اس کے بندوں کو بھی الوہیت میں شریک ٹھہرایا جائے۔ ﴿مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ [3]﴾ قرآن کریم موجود ہے اور انسان عقل سے بھی محروم نہیں ہوا۔ اگر متاع ہوش و خرد بھی غیر اللہ کی نذر نہ کی گئی ہو تو ﴿......اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ......الخ [4]﴾ کی تمثیل قرآن کریم میں نظر آتی ہے:

﴿وَ نُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ فَنَجَّیۡنٰہُ وَ اَہۡلَہٗ مِنَ الۡکَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ﴾

(الانبیاء۲۱: آیت ۷۶)

''اور نوح جبکہ ان سب سے پہلے اس نے ہمیں پکارا تھا۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے اور اس کے گھر والوں کو کرب عظیم سے نجات دی۔''

﴿وَ اَیُّوۡبَ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ۚ﴿ۖ۸۳﴾ فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ فَکَشَفۡنَا مَا بِہٖ مِنۡ ضُرٍّ......الخ﴾ (الانبیاء۲۱: آیت ۸۴،۸۳)

''اور یہی (ہوشمندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوب کو دی تھی۔ یاد کرو، جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ ''مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔'' ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اسے تھی اس کو دور کر دیا......الخ''

﴿وَ ذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّہَبَ مُغَاضِبًا......الخ﴾ (الانبیاء۲۱: آیت ۸۷)

---

[1] الفاتحہ ۱: آیت ۴ ـــ (ترجمہ) ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔''

[2] الانعام ۶: آیت ۱۲۶ ـــ (ترجمہ) ''میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں......الخ''

[3] الصافات ۳۷: آیت ۱۵۴ ـــ (ترجمہ) ''تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسے حکم لگا رہے ہو؟''

[4] البقرہ ۲: آیت ۱۸۶ ـــ (ترجمہ) ''...... پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں......الخ''

''اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا۔ یاد کرو جب کہ وہ بگڑ کر چلا گیا تھا......الخ''

ان انبیاء علیہم السلام کی مثالوں سے اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کو پکارنے والوں پر حجت تمام کر دی ہے:

﴿أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ (یونس ١٠: آیت ٦٦)

''یاد رکھنا چاہیے کہ وہ تمام ہستیاں جو زمین و آسمان میں ہیں، سب اللہ ہی کی تابعدار اور فرمانبردار ہیں اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا (اپنے بنائے ہوئے) معبودوں کو پکارتے ہیں، تم جانتے ہو کہ وہ کس کی پیروی کرتے ہیں۔ (یقین و بصیرت کی نہیں) وہ تو محض وہم و گمان کے پیچھے چلتے ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں، کہہ دو کہ (ہر بات میں) اپنی اٹکلیں دوڑاتے پھرتے ہیں!''

﴿......فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ......﴾ (یونس ١٠: آیت ٣٢)

''......حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے!......''

عالم اسلامی میں آج کتنے مسلمان ایسے ہیں جو کلمہ حق لا الٰہ الا اللہ کے عملی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہوں۔ کوئی پیر پرستی میں مبتلا ہے تو کوئی نجومیوں اور اشتہاری پامسٹوں کے ہاتھوں توہم پرستی سے اپنے ایمان کو برباد کر رہا ہے، کسی کو مفاد پرستی سے فرصت نہیں، تو کوئی اقتدار کے نشے میں نفس پرستی کر رہا ہے اور موجودہ دور کا سب سے بڑا فتنہ یہی ہے!

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا!

"قبر"---سب جانتے ہیں کہ یہ لفظ عام طور پر اس دوگز زمین کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں مردہ دفن کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی بدیہی و یقینی بات ہے کہ دنیا میں ہمیشہ توحید و رسالت اور آخرت ہی کا نہیں بلکہ وجود رب العالمین تک کا انکار کیا گیا ہے اور آج بھی بہت سے لوگ اس کے منکر ہیں، مگر موت کا انکار نہ پہلے کسی نے کیا اور نہ قیامت تک اس کا انکار کرنے والا کوئی پیدا ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ جہاں چار گھر بھی زندہ انسانوں کے بنے ہوئے ہوں وہاں مُردوں کے مکانات بھی بنیں۔ چنانچہ ہر خورد وکلاں، ہر غریب و امیر، ہر عالم و عامی اور ہر ولی و نبی کی قبریں زندہ انسانوں کے مسکونہ مکانات کے پہلو بہ پہلو بنتی چلی گئی ہیں اور کوئی بستی ان دونوں قسم کے مکانات سے خالی نہیں پائی جاتی۔ مگر ہر طبقہ اور ہر مرتبہ و مقام کے مردہ انسانوں میں سے خصوصیت کے ساتھ "صوفیاء" و "اولیاء" کی قبریں زیادہ اعتنا کے لائق قرار پاتی رہی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ تمام انسانوں کی طرح "صوفیا و اولیاء" بھی موت کا مزہ چکھتے ہیں اور زمین میں دفن ہوتے ہیں، ان پر دوسروں کی طرح منوں مٹی ڈال دی جاتی ہے اور دوسروں ہی کی طرح قبر بھی بنا دی جاتی ہے۔ مگر اس جماعت کے بھی چند خاص خاص افراد کی قبروں پر عامۃ الناس کی توجہ زیادہ سے زیادہ مرکوز ہونی شروع ہوتی ہے اور چند ہی دنوں میں کہیں محض اینٹ پتھر اور چونہ گچ اور کہیں نہایت قیمتی پتھروں سے قبر پختہ کر دی جاتی ہے اور دوسری قبروں کے مقابلہ میں دیکھتے دیکھتے یہ قبریں نمایاں اور ممتاز ہو جاتی ہیں۔

پھر قبر کے اطراف میں ایک کٹہرا تیار ہوتا ہے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ کہیں معمولی عمارت اور کہیں نہایت مضبوط قبے تعمیر ہو جاتے ہیں۔ یہ قبے کہیں کہیں تو اتنے بلند و بالا اور ایسے عظیم الشان ہوتے ہیں کہ باقاعدہ آثار قدیمہ میں داخل کر لیے جاتے ہیں۔ پھر ان میں فن تعمیر کی ایسی ایسی نادرہ کاری پائی جاتی ہے کہ محض آثار قدیمہ و فن تعمیرات سے دل چسپی لینے والوں ہی کے لیے نہیں بلکہ ہر آیند و روند کی توجہات کا مرکز بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس طرح ایک ایک قبر کئی کئی ایکڑ زمین کو مستقل طور پر گھیر لیتی ہے۔ رفتہ رفتہ گنبد کے آس پاس دوسری عمارتیں بننے لگتی ہیں اور چھوٹی موٹی سی نو آبادی بس جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ قبریں عوام کی توجہات کا ایسا بڑا مرکز ومرجع بنتی ہیں کہ جوق در جوق لوگ وہاں کھنچے چلے جاتے ہیں۔ توجہات کی اس درجہ مرکزیت ومرجعیت کے بعد ناممکن ہے کہ کوئی طبقہ ایسا پیدا نہ ہو جو ان توجہات کو کنٹرول کرے اور اس مرجعیت ومرکزیت سے فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ بہت سے لوگ قبروں کی ''خدمت'' کا ''منصب'' سنبھال بیٹھتے ہیں اور ''خادم''، ''جاروب کش''، ''مجاور'' اور ''سجادہ نشین'' وغیرہ مختلف القاب سے پکارے جاتے ہیں۔

[جو فی الحقیقت اپنے پیٹ کی ''خدمت'' کرنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ پھر ایسے مجہول الحال اور مجہول العقل لوگوں کی پستی ذہنیت کا اندازہ کیجئے کہ جائز اور حلال ذرائع کو چھوڑ کر وہ قبروں اور مُردوں سے اپنا رزق لیتے اور مانگتے ہیں، العیاذ باللہ! یہی نہیں بلکہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی شرکیہ عقائد اور بدعات وخرافات میں مبتلا کرتے ہیں ---ادارہ]

ان لوگوں کو ایسے ایسے ''اعزازات'' حاصل ہوتے ہیں کہ کسی کو ان کی عملی زندگی اور ان کے عام مشاغل پر نظر کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ محض قبر کی ''نسبت'' یا اس کی ''خدمت'' ہی انہیں سب کچھ بنا دیتی ہے۔ انہیں ہر ''زائر'' اور سیاح سے بھی کچھ نہ کچھ ''نذرانہ'' لینے کا حق ہوتا ہے اور قبر کی ''نسبت'' یا ''خدمت'' کا نام لے کر لوگوں سے چندہ مانگنا بھی جائز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات ان کی مالی حالت پوری بستی کے لوگوں سے بہتر ہوتی ہے اور نہایت عیش وآرام سے گزرنے لگتی ہے۔ مگر ان لوگوں کے لیے اتنے ہی پر اکتفا کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے وہ قبر کی ''نسبت'' کے ساتھ ساتھ صاحب قبر سے بھی کوئی نہ کوئی نسبت پیدا کر لیتے ہیں، یا کسی نہ کسی سلسلہ ''تصوف'' سے وابستہ ہو جاتے ہیں تاکہ دنیوی اعزاز واکرام کے ساتھ ساتھ روحانی ودینی پیشوائی کا مقام بھی حاصل ہو جائے اور ''روحانیت'' کے پردہ میں اتنا کچھ مل جائے جتنا عام دِنیاداروں کو بھی بمشکل ملا کرتا ہے!

[یہ جائز تو نہیں البتہ جن لوگوں کو حلال وحرام اور جائز وناجائز کی تمیز ہی نہ ہو نہ وہ اس کی کچھ ضرورت شعوری طور پر سمجھیں تو وہ حرام وناجائز امور کو بھی اپنے لیے جائز وحلال ہی سمجھتے ہیں ---ادارہ]

چنانچہ عوام الناس ہی کے ذریعہ سے یہ ''معزز ومکرم'' نہیں بنے بلکہ مسلم حکومتیں بھی ان پر اتنی نظر عنایت فرماتی رہی ہیں کہ انہیں بڑی بڑی جاگیریں اور جائدادیں ملی ہیں اور ان میں سے کتنے ایسے ہیں کہ مذہبی وروحانی مشیخت تو خیر، ان کی دنیوی ریاست اور مادی منفعت کو دیکھ کر پکے دنیادار بھی حرص وطمع کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بڑے بڑے سرمایہ دار اور کارخانہ دار بھی ان سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر

سکتے!

اچھا اب قبر کے پاس تشریف لے چلیں۔مگر کتنی ہی قبریں ایسی ہیں کہ اصل قبر سے فرلانگ دو فرلانگ ادھر ہی آپ کو اپنی جوتیاں چھوڑنی پڑیں گی۔آپ چاہے عام قبروں پر سے جوتیوں سمیت ہی کیوں نہ گزر جائیں،مگر یہاں آپ اپنی جوتیاں قبر کے پاس بھی نہیں لے جا سکتے۔ارے! یہاں تو چاروں طرف جھنڈے ہی جھنڈے اور نشان ہی نشان نظر آتے ہیں! جی ہاں! چاہے سینکڑوں غریب غرباء کے بدن جاڑے کے دنوں میں لباس کی کمی کے باعث ٹھٹھر رہے ہوں اور ان میں کوئی اکڑ کر اپنی جان ہی دے دے۔بہرحال سینکڑوں گز کپڑا یہاں نشانوں میں صرف ہوتا رہتا ہے!

آپ احاطہ گنبد کے صدر دروازہ سے لے کر ''مزار شریف'' تک ''نہ جائے گا اس در سے کوئی بھی خالی'' اور ''نیست کعبہ ورد کن جز درگہ بندہ نواز'' وغیرہ کی قسم کے سینکڑوں فقرے اور اشعار بھی پڑھتے جائیے--- اندر چلئے یہاں کی پوری فضا عود،لوبان اور دوسری خوشبوؤں سے کس درجہ معطر ہے اور ''مزار شریف'' پر کتنے قیمتی غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔افوہ! اس درجہ قیمتی کپڑے تو صرف گزرے ہوئے شاہان نے پہنے ہوں گے یا پھر موجودہ دور میں امیر امراء کے گھرانوں میں پہنے جاتے ہوں گے۔ظاہر ہے کہ غرباء و مساکین نے تو انہیں خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔خیر! وہ خواب میں دیکھیں یا نہ دیکھیں،وہ یہاں بیداری میں تو دیکھ سکتے ہیں۔

اور ''مزار'' پر پھول بھی کس کثرت سے چڑھائے گئے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ گلستانوں اور پھلواریوں کو لاکر یہاں الٹ دیا گیا ہے۔ارے! یہ ''زائر'' صاحب تو چوکھٹ ہی کو بوسہ دے رہے ہیں۔اور یہ کیا؟ یہ صاحب تو قبر کے گرد بھی گھوم رہے ہیں۔ارے! یہ تو قبر کو بھی چوم رہے ہیں۔کبھی سر رکھ دیتے ہیں اور کبھی آنکھیں۔ارے! یہ تو عجیب عجیب بے معنٰی حرکات بھی کر رہے ہیں۔کہیں انہیں کچھ جنون تو لاحق نہیں ہوگیا ہے؟ خیر! یہ حرکات بے معنٰی ہیں یا بامعنٰی اور یہ صاحب مجنون ہیں یا عقلمند؟ اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوتا رہے گا۔آپ نے قبر کے اوپر کاغذوں کے لٹکتے ہوئے پلندے نہیں دیکھے؟ ارے! یہ تو باقاعدہ درخواستیں اور التجائیں ہیں۔کسی میں لکھا ہے کہ روزگار دلوایئے۔کسی میں تحریر ہے کہ اولاد دیجیے۔کسی میں مقدمہ جتوادینے اور مرض کو دور کردینے کی فرمائش ہے۔کسی میں آفات و بلیات کو ٹال دینے اور بدقسمتی کو خوش قسمتی سے بدل دینے کا مطالبہ ہے۔یہ صاحب تو الٹے پاؤں دروازہ کی طرف جارہے ہیں۔جی ہاں! جاتے ہوئے ''مزار'' کی طرف پشت ہوتی ہے نا! اور ادھر دیکھیے! یہ بیچاری اللہ کی

بندی قبر کی طرف رخ کیے سجدہ ہی میں پڑی ہوئی ہے۔اب چلیے! یہاں عورتوں کی گزر بھی ہے!

[اس روئے زمین پر سب سے متبرک مقام، مکہ میں واقع بیت اللہ شریف ہے جہاں حج ہوتا ہے۔ جسے اللہ کے دوست جناب ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا اور جس میں ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ تک ایک کثیر تعداد میں انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے۔ پھر نبی کریم ﷺ کے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کے ساتھ ایک خصوصی تعلق حاصل رہا جن کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس زمین پر رہتے ہوئے یعنی ان کی زندگی میں ہی **رضی اللہ عنھم ورضوعنہ** کی بشارت دے کر جنتی سرٹیفکیٹ عطا کیا۔اس کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت کے اس گھر کو اور کئی اعزاز حاصل ہیں، مثلاً حجر اسود، بیت اللہ شریف میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے ثواب کے برابر ہونا...... وغیرہ! اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں اور صاحب شریعت ﷺ نے اپنے امتیوں پر اس مقدس گھر اور اس میں موجود خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ نہ کرنے کی کوئی پابندی اور شرط عائد نہیں کی۔ ایک طرف یہ معاملہ ہے اور دوسری طرف ''مزاروں'' کی طرف ''زائروں'' کی پشت نہ کرنے کی خرافاتی روایات دیکھیے، جہاں جانے کا نہ صرف یہ کہ حکم نہیں اور منع کیا گیا ہے بلکہ یہاں جانا شرک اور بدعات کے زمرہ میں داخل ہے۔ جب دینی شعور اور عقل سلیم کی موت واقع ہو جائے تو انسان یہی کچھ کرے گا---ادارہ]

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان ''مزاروں'' پر کہیں کہیں ہفتہ واری اور ماہانہ اور بالعموم سالانہ ایک میلہ لگتا ہے، ان میلوں کی شان صاحب قبر کے شایان شان مذہبی جلسوں اور سیاسی تقریبات سے بھی چھ اونچی ہوتی ہے۔ آرائش و زیبائش، آرام و انتظام اور وسعت و کثرت کے لحاظ سے یہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ان موقعوں پر ہزاروں، لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، جو نہ معلوم کن کن جیبوں سے نکل کر کن کن طریقوں سے آتا اور چلا جاتا ہے۔عام بولی میں ان میلوں کو ''عرس'' کہا جاتا ہے۔جس کا معنی عربی زبان میں 'شادی' ہے۔ایک شخص اس خوشی کے موقع پر انفرادی طریقہ سے جتنا کچھ خرچ کر سکتا ہے اور کرتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ پھر جب سینکڑوں ہزاروں، لاکھوں افراد اجتماعی طور پر ''عرس'' کریں تو جو کچھ خرچ ہوتا ہے اس کا اندازہ شاید ممکن نہیں۔ یہ اعراس کہیں کہیں ایک دن کے لیے اور کہیں کہیں آٹھ دس دس دن کے لیے منعقد ہوتے ہیں اور ان کے لیے اشتہارات اور پوسٹروں سے لے کر دعوت ناموں تک تمام وسائل نشر و اشاعت استعمال کیے جاتے ہیں۔ یوں بھی ان کی تشہیر کی اتنی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ،لوگ خود ہی ان تاریخوں کو جانتے ہیں جن میں انہیں کسی ''مزار'' پر'' حاضر'' ہونا ہے!

اس کے لیے وہ سال سال بھر سے پیسہ پیسہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ پیسہ نہ ہو تو قرض لے لیتے ہیں اور بسا اوقات تن کے کپڑے اور برتن کی چیزیں تک گروی رکھ دیتے ہیں۔اپنے ضروری سے ضروری کاموں کا حرج کرتے ہیں، کیونکہ انہیں ''سب سے زیادہ ضروری'' کام کے لیے جانا ہوتا ہے۔اپنے مصارف سفر کا بندوبست کرتے ہیں، کیونکہ اگر اس مصرف کا بندوبست نہ ہوا تو پھر آمدنی کے سارے

راستے ہی بند ہو جائیں گے---اور ٹھیک وقت پر "مزار شریف" کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

[اسلام میں فرض عبادات میں سے اہم ترین عبادت یعنی نماز جو ہر بالغ مسلمان پر پانچ وقت باجماعت طور پر فرض ہے، وہ رہ جائے تو رہ جائے لیکن "عرس" جیسی تقریبات جن سے شریعت اسلامیہ نے منع کیا ہے، ان میں یہ لوگ شرکت ضرور کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر افراد کا یہی طرز فکر ہوتا ہے۔ یہ بد عملی اور غلط طرز فکر وعمل کی انتہا ہے---ادارہ]

اس جم غفیر میں آپ ہر خورد وکلاں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں سمجھ دار بھی ہیں اور بے سمجھ بھی، آوارہ وبد معاش بھی ہیں اور سیدھے سادھے بھولے بھالے بھی، جوان بھی ہیں اور بوڑھے بھی، معذور بھی ہیں اور بیمار بھی، داڑھی والے بھی ہیں اور داڑھی منڈے ہوئے بھی، نمازی بھی ہیں اور بے نمازی بھی، غریب بھی ہیں اور امیر بھی، خوش حال بھی ہیں اور بد حال بھی۔ کوئی تو چیتھڑے لگائے ہوئے آ گیا ہے اور منہ سے پھونک پھونک کر آگ جلا رہا ہے، تاکہ روٹی کی ٹکیہ پکائے اور پیٹ کی آگ بجھالے۔ یہاں کی رنگا رنگی تو بس دیکھنے ہی کے لائق ہے!

ارے! اس جم غفیر میں عورتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ لائی ہیں! اور نہ معلوم کہاں کہاں سے آئی ہیں؟ ارے! یہ تو اچھی خاصی برقع پوش معلوم ہوتی ہیں، مگر انہیں یہاں برقع کا ہوش نہیں...... جی! یہاں عقیدت کا جوش ہے! برقع کا کسے ہوش ہے!۔ لیجئے! یہ بی بیاں تو خوب بے پردہ ہو کر پھر رہی ہیں۔ جی! یہاں سارے زائرین قبر ہی کے زائرین نہیں ہیں، "زائرین حسن" بھی ہیں۔ عورتیں یہاں مردوں کے دوش بہ دوش ہیں۔ کندھے سے کندھا ہی نہیں ملتا، نظروں سے نظریں بھی ملتی ہیں اور دل سے دل بھی ملتے ہیں، استغفر اللہ! آپ کو یہاں اگرچہ سب کچھ ملے گا مگر قبر اور صاحب قبر کی نسبت کے باعث آپ اس کا تصور آسانی کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ سب کچھ قبر کے اندر نہیں ہو رہا جسے آپ دیکھ نہ سکیں، یہ تو باہر ہی باہر ہے۔ اس لیے اگر واقعات وحقائق کی شہادت ایک مسلمہ شہادت ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ کھلم کھلا نظر بازی بلکہ "عشق بازی" بھی ہو رہی ہے۔ مگر چونکہ اس پر "روحانیت" اور "مذہبیت" کا پردہ پڑا ہوا ہے، اس لیے یہ باتیں "خلوتیان راز" تک ہی عام طور پر محدود رہتی ہیں!

[صاحب مضمون کی یہ تحریر سن ۱۹۵۷ء میں ماہر القادری رحمہ اللہ کے مشہور جریدہ "فاران" میں شائع ہوئی تھی، یعنی آج سے ۴۵ سال قبل۔ خواتین کے پردہ کے حوالہ سے یہ ان کا تب کا مشاہدہ ہے۔ اس وقت فی الواقع پردہ کا تصور بہت عام تھا۔ اب تو "مزاروں" پر بے پردہ عورتوں کی غالب اکثریت جاتی ہے۔ لیکن اصل بات جو قابل غور وفکر ہے، وہ یہ ہے کہ "مزاروں" (جن کی دین کے نزدیک ذرہ برابر بھی کوئی مثبت حیثیت نہیں بلکہ ان کی سخت ممانعت کی گئی ہے) کی "زائرین" خواتین باپردہ ہوں یا بے

پردہ،اس سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ ''مزاروں'' پر جو اخلاقی قباحتیں اور حرکات ہوتی ہیں،ان سے متاثرہ خواتین میں بے پردہ اور باپردہ دونوں طرح کی خواتین شامل ہوتی ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جہالت اور بے دینی کی بناء پر ''مزاروں'' پر شرک وبدعات میں مبتلا ہونے اور ایمان کی دولت کا ستیاناس کرنے والی عورتوں میں باپردہ اور بے پردہ دونوں قسم کی عورتیں ہوتی ہیں، العیاذ باللہ!---ادارہ]

مگر چھوڑ یئے مکروہ باتوں کا ذکر بھی مکروہ معلوم ہوتا ہے۔آپ نے ''عرس'' کا نظام نامہ ملاحظہ نہیں فرمایا۔ یہ دیکھیے! ارے! اس میں یہ صندل، مالیدہ، چڑھاوا، نشان، فاتحہ، نیاز اور اسی قبیل کی بیسیوں عجیب باتیں موجود ہیں۔ جی! یہ عجیب ہوں تب بھی ان پر تعجب نہ کیجئے اور عجیب وغیر عجیب کا فیصلہ ابھی سے کیوں کیجئے گا۔ کچھ نیچے دیکھئے۔ ہاں! اس میں ''مجلس سماع'' کا ذکر ہے۔ مشہور قوالوں کے نام ہیں۔مگر اور بھی کچھ ہے؟۔ جی! کچھ گانے اور ناچنے والیوں کے نام بھی لکھے ہیں۔ یہاں ناچ گانا صاحب ''مزار'' کی روح کو خوش کرنے کے لیے ہوگا۔ یہ ''طریقت''، ''جذب وسوز'' اور ''کیف وعرفان'' کی دنیا ہے۔یہاں ''شریعت'' کے قانون نہیں چل سکتے!

[یہ اہل ''تصوف وطریقت'' کی کی ہوئی تقسیم ہے کہ شریعت کی دنیا اور اصول اور ہیں،اور ''طریقت'' کے اصول اور، جس کی ان کے پاس کوئی دلیل اور سند موجود نہیں---ادارہ]

اچھا! ادھر دیکھیے! جانور ذبح کیے جا رہے ہیں۔ کتنے ہی جانور صاحب قبر کے نام پر پن کر کے چھوڑ دیئے گئے ہیں، جنہیں ہاتھ تک نہیں لگایا جا سکتا۔ جاہل لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ جس کھیت میں جا پڑیں، کھیت والے کے نصیب جاگ اٹھیں گے۔ وہ جہاں سے پانی پی لیں وہاں برکت ہی برکت ہوگی۔ کتنے ہی جانور اس لیے ذبح کیے جا رہے ہیں کہ ان کو ذبح کرنے کی منت مانی گئی تھی۔ان کو ذبح کرتے ہوئے چاہے جس کا نام لیا جائے مگر وہ ذبح ہو رہے ہیں ایک خاص طریقہ پر، خاص جگہ پر، خاص وقت میں! یہاں تک کہ اس طریقہ سے ہٹ کر، اس جگہ کو چھوڑ کر، اس وقت کو ٹال کر کوئی شخص انہیں ذبح کرنے پر آمادہ نہیں۔ پھر جانوروں کی خریداری سے لے کر ان کے گوشت کی تقسیم اور کھانے پکنے اور خرچ ہو جانے تک کے آداب اور بے ادبیوں کی اقسام حدوشمار سے باہر ہیں!

[ہم ایسے واہیات اور خرافاتی عقیدوں اور گمراہیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں---ادارہ]

''مزار شریف'' پر چلیے۔ اوہ! وہاں تو بڑی بھیڑ لگی ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کی الگ الگ صفوں کا امتیاز مفقود ہے۔ خیر! جو کچھ اندر ہو رہا ہے، اسے آپ نہ دیکھ سکیں تو یہی بہتر ہے! دروازہ سے لگ کر کھڑے ہو جایئے، کم از کم ہر آیند

ورونڈکی حرکات وسکنات ہی دیکھ لیجیے۔اور اگر اس ''نظارے'' سے آپ تھک گئے ہیں تو لوٹ آیئے مگر ان قبروں کو ضرور دیکھ لیجیے! جن میں کوئی جسم دفن نہیں۔ محض قبروں کی شکل دے کر انہیں کسی ''بزرگ'' کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔

[دکن میں ان مصنوعی قبروں کو عامۃ الناس ''چھلہ'' بولتے ہیں]

''زائرین'' بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ مصنوعی قبریں ہیں۔ مگر انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان قبروں پر ''بزرگان دین'' کا نام لینے سے انہیں دین میں بزرگی کا مقام حاصل ہو گیا ہے، اس لیے وہ ان کے بھی گرویدہ ہیں اور یہاں آپ وہ سب چیزیں پائیں گے جنہیں آپ ''عجیب'' قرار دے رہے تھے، تاہم اگر ان عجائبات سے آپ کے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہونے لگی ہے تو اب اپنے گھر آ جائیے!

سوال یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، کیا یہ سب یوں ہی ہے؟ کیا اس کے کوئی وجوہ واسباب نہیں؟ کیا دنیا میں کوئی ایسا عمل بھی پایا جاتا ہے جو کسی نہ کسی عقیدہ وایمان کا مظہر نہ ہو؟ کیا آپ کسی ایسی سرگرمی کا پتہ دے سکتے ہیں جس کا کوئی داعیہ، جس کا کوئی نظریہ، جس کا کوئی محرک سرے سے موجود ہی نہ ہو؟ کیا آپ کسی ایسی حرکت کے قائل ہیں مقصد وارادہ اور نیت کے بغیر ہی ہو جایا کرتی ہے؟ ظاہر ہے کہ انسان کا ہر عمل اس کے قلبی عقیدہ وایمان کا مظہر ہوتا ہے۔ انسان کی سرگرمیاں اپنے داعیات، نظریات اور محرکات کا آپ پتہ دیتی ہیں۔ انسان کی حرکات وسکنات اس کے قصد وارادے اور نیت ہی پر محمول کی جاتی ہیں۔ بلا قصد وارادہ سرزد ہونے والی حرکت وسکنات میں نہ تو اہتمام ہوتا ہے نہ اصرار، نہ استقلال ہوتا ہے نہ دوام۔ بمصداق حدیث نبوی ﷺ ''انسان کے تمام اعمال کا دارومدار اس کی نیتوں ہی پر ہوتا ہے۔'' پس چند مخصوص ''اولیاء وصوفیاء'' کی قبروں کے ساتھ یہ غیر معمولی برتاؤ غلط اور باطل اعتقادات پر مبنی ہے، ان کا خلاصہ یہ ہے:

وہ خیالات واعتقادات جو قبر پرستی کا اصل سبب ہیں، آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ اگر آپ اس کے کسی جزیہ کو بھی الگ کر دیں تو شاید اس عمارت کی پوری اینٹیں ہی کھوکھلی ہو کر رہ جائیں اور پھر یہ عمارت بھی ایک خاص بنیاد پر قائم ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سارے اصول وفروع درست ہیں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے پہلے حق وباطل کا ایک معیار متعین کرنا چاہیے۔ جہاں تک غیر مسلم قوموں کا تعلق ہے، ان میں یہ معیار کبھی متفق علیہ نہیں رہا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت پر ایمان نہ لانے کے سبب ان کا ہر وادی میں بھٹکنا قدرتی بات ہے۔ برخلاف اس کے مسلمان، مسلمان ہونے کی

حیثیت سے معیار حق و باطل کے تعین میں کبھی مختلف الخیال نہیں ہو سکتے۔ وہ چاہے دنیا کے کتنے ہی گوشوں میں بکھرے ہوئے ہوں اور علم و ایمان کے کسی درجہ پر ہوں، ان کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف قرآن ہے اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی سنت۔ ان دونوں بھاری چیزوں کے بعد اگر کوئی چیز ان کے نزدیک لائق توجہ یا لائق پذیرائی ہو سکتی ہے تو صلحاء و علماء امت کے صرف وہ اقوال و افعال جو کتاب و سنت کے عین مطابق یا روح اسلامی سے قریب تر ہوں۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو چاہے کسی بات کو ساری دنیا کہتی ہو اور کوئی کام ساری دنیا میں کیا جاتا ہو مسلمان کے نزدیک اس کی قدر و قیمت اتنی بھی نہیں جتنی مٹی کے ایک ذرہ یا گھاس کے ایک تنکے کی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ تو اپنے مشن کے لحاظ سے مامور ہی اس بات پر ہے کہ ہر خلاف کتاب و سنت چیز کی تردید کرے اور عملاً ہر منکر کو مٹانے اور ہر معروف کو قائم کرنے کی جدو جہد کرتا رہے، یہاں تک کہ اس راہ میں اپنی جان دے دے!

[صلحاء و علماء امت کے اقوال و افعال کی حیثیت قرآن و احادیث میں موجود دین کی صحیح و صریح نصوص و تعلیمات کی تشریحات و توضیحات کی ہے، احکام کی نہیں---ادارہ]

اس نقطہ نظر سے دیکھیے تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ جن اعتقادات و نظریات کی بناء پر مسلمان قبر پرستی میں مبتلا ہیں وہ سرے سے باطل ہیں اور ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کے خیالات و اعتقادات صرف اس شخص کے دل و دماغ میں راہ پا سکتے ہیں جس نے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش نہیں کی، یا کی تو اپنے مزعومات و مفروضات کی تائید و سند کے لیے! ورنہ قرآن نے اتنی وضاحت و صراحت کے ساتھ حق و باطل کو ممیز کر کے رکھ دیا ہے اور دنیا میں پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کو اتنی خوبی اور حکمت کے ساتھ صاف کر دیا ہے کہ اگر کوئی شخص پورا قرآن نہ سہی اس کا کوئی ایک حصہ بھی طلب ہدایت کے لیے پڑھ لے تو اس کے دل و دماغ میں اس قسم کے خیالات و اعتقادات کے در آنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہم قرآن کی کون کون سی آیات اور کون کون سی سورتیں اپنے مدعا کی توضیح میں پیش کریں۔ قرآن کی تعلیم اتنی صاف ہے اور آسان ہے کہ ہر مرتبہ عقل کا انسان بخوبی اسے جذب کر سکتا ہے۔ پھر کیوں نا پورا قرآن ہی سامنے رکھ دیں اور یہ مخلصانہ گزارش کر دیں کہ خالی الذہن ہو کر چشمہ ہدایت سے سیرابی حاصل کرنے کی نیت سے قرآن پڑھیے ورنہ پیشگی قائم کیے ہوئے نظریات و اعتقادات لیے ہوئے (خصوصیت سے جبکہ ان کے ساتھ انتہائی تعصب موجود ہو) اگر قرآن پڑھا جائے گا تو دراصل قرآن کی آیتیں نہیں پڑھی جائیں

گی، بلکہ اپنے ہی خیالات ونظریات کی تلاوت ہوگی۔ تاہم چند آیات بطور مثال ملاحظہ ہوں۔

سورۂ فاطر میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے:

﴿......وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝﴾ (فاطر ۳۵: آیت ۱۳، ۱۴)

''اس کے سوا تم جن کو پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ اگر تم ان کو پکارو تو وہ تمہاری پکار نہ سنیں اور اگر سن لیں تو تمہیں جواب نہ دے سکیں۔ قیامت کے دن وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے اور تجھ کو ایک باخبر شخص کی طرح کوئی نہیں بتلائے گا!''

اس آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہاں بے جان معبودوں کا ذکر نہیں ہو رہا بلکہ جاندار اور ذی شعور ہستیوں کا ذکر ہے۔ کیونکہ پکار کا نہ سننا، سن لیں تو جواب دینے یا کام بنا دینے کا اختیار نہ رکھنا اور شرک سے انکار کر دینا لکڑی پتھر کی مورتیوں کے افعال نہیں ہیں۔ انہیں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے صاف خبر دی ہے کہ انہیں کسی قسم کا اختیار نہیں دیا گیا۔ انہیں جو لوگ طلب حاجات کے لیے پکارتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل کو ''شرک'' قرار دیا ہے اور خبر دی ہے کہ قیامت میں وہ اس شرک کا انکار کریں گے۔ شرک کے انکار کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس فعل کے شرک ہونے کا انکار کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود جس فعل کو شرک ٹھہرائے اس کا انکار کسی کے بس میں نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ زبردستی کے بنائے ہوئے وہ معبود اس فعل سے اپنی برأت ظاہر کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ نہ ہم نے انہیں یہ فعل کرنے کا حکم دیا تھا! اور نہ ہمیں یہ اطلاع تھی کہ ہمارے پیچھے کس نے ہمیں کیا کچھ بنا رکھا ہے؟ اللہ نے یہ خبر اس لیے دی ہے کہ جو لوگ غلط امیدوں کے سہارے پر اپنی زندگی گزار رہے ہیں ان کو پیشگی متنبہ کر دیا جائے تاکہ قیامت کے دن وہ اپنی امیدوں کے طلسم کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر پچھتانے کی بجائے ابھی سے اپنی غلط فہمیوں کو دور کر لیں اور صحیح رویہ پر قائم ہو جائیں۔ چنانچہ آیت کا آخری فقرہ خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ مقصود بیان یہ ہے کہ اللہ خبیر وعلیم سے بڑھ کر صحیح خبریں تمہیں کون بتا سکتا ہے۔ پس جو کچھ اللہ نے بتا دیا ہے اس سے کم یا زیادہ پر ایمان لانا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ علم وخبر کا سرچشمہ تو وہی ہے۔ جب وہیں سے تم کو وہ خبریں نہیں مل سکتیں جنہیں تم مان رہے ہو تو بے خبری کے اندھیرے میں جو کچھ تم کرو گے، اس کا نقصان تمہیں کو اٹھانا پڑے گا۔

اسی سورۂ فاطر میں آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ اَرَئَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا○﴾ (فاطر ۳۵: آیت ۴۰)

''کہہ دو کہ ذرا اپنے شریکوں کو تو دیکھو جنہیں اللہ کو چھوڑ کر تم پکارا کرتے ہو۔ مجھے دکھاؤ کہ آخر انہوں نے زمین کا کون سا حصہ پیدا کیا ہے یا آسمانوں میں ان کا کوئی ساجھا ہے یا پھر ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے کہ یہ اس کی سند پر قائم ہیں؟ بات یہ ہے کہ ظالم ایک دوسرے سے جو کچھ وعدہ کر رہے ہیں وہ محض دھوکا ہے۔''

یعنی یہ اپنے رویہ کے حق میں عقلی و نقلی کسی قسم کی دلیل نہیں رکھتے۔ اگر رکھتے ہیں تو بتاتے کیوں نہیں کہ زمین و آسمان کی تخلیق میں ان کے اپنے معبودوں کا کیا حصہ ہے؟ یا پھر یہی بتا دیں کہ ہم نے آخر کہاں کس جگہ اور کب یہ حکم دیا ہے کہ چونکہ ہماری سلطنت چند بااختیار ہستیوں کے درمیان بٹی ہوئی ہے، جن میں سے ہر ایک تمہاری پکار کا مستحق ہے لہٰذا انہیں پکارا کرو؟ جو لوگ عقلی و نقلی دلائل سے بے نیاز ہو کر بے بنیاد عقیدے اور طریقے اختیار کرتے ہیں وہ ظالم ہیں اور آپس میں یہ جو کچھ وعدے کرتے ہیں وہ صرف دھوکا ہے!

یہی مضمون سورۃ الاحقاف میں ارشاد ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ○ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ○﴾

(الاحقاف ۴۶: آیات ۴ تا ۶)

''کہہ دو! ذرا دیکھو کہ تم اللہ کو چھوڑ کر جن ہستیوں کو پکارتے ہو، مجھے بتاؤ کہ انہوں نے آخر زمین کا کون سا حصہ پیدا کیا ہے یا آسمانوں میں ان کی کوئی شرکت ہے؟ اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب یا کوئی علمی روایت پیش کرو۔ اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان ہستیوں کو پکارے جو قیامت تک اس کی دعا قبول نہیں کر سکتیں، بلکہ ان کی دعا سے بھی وہ بے خبر ہیں۔ جب لوگوں کو جمع کیا

جائے گا تو وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔"

ان آیات سے حسب ذیل حقائق بداہتہً ثابت ہیں:

۱) "عبادت" محض نماز روزہ کا نام نہیں ہے بلکہ دعا بھی عین عبادت ہے۔ جو شخص نماز روزہ اللہ تعالیٰ کے لیے کرے، لیکن مشکل کشائی، فریادرسی اور قضاء حاجات کے لیے اسے چھوڑ کر کسی اور کو پکارے، وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو عبادت میں شریک کرنے کا (یعنی شرک کا) مجرم ہے۔

[احادیث میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:- "دعا ہی عبادت ہے۔" (احمد، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ بحوالہ مشکوۃ المصابیح، کتاب الدعوات، حدیث ۲۲۳۰، صحیح - ادارہ]

۲) یہ پرلے درجہ کی گمراہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں کو پکارا جائے، کیونکہ کوئی اور ہستی کسی کی پکار کا جواب دینے پر قادر نہیں اور جواب دینا تو ایک طرف کسی کو کسی کی پکار کی خبر تک نہیں ہوتی۔ حد یہ ہے کہ یہاں جن جن ہستیوں کو لوگوں نے معبود بنا ڈالا انہیں جب قیامت کے دن اس کی اطلاع ہوگی تو اس پر ان کا خوش ہونا تو درکنار الٹے وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت کا صاف انکار کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں لوگوں کا یہ طرز عمل اتنی شدید ضلالت ہے جس سے زیادہ کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا!

[اس سے زیادہ سچی بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ اس کائنات میں صرف ایک ہی معبود ہے، اور وہ ہے صرف اللہ وحدہ لاشریک۔ چونکہ وہی معبود حقیقی ہے، اس لیے صرف وہی یہ جانتا ہے کہ کون اس کی عبادت کر رہا ہے اور کون دوسروں کی۔ صرف اللہ رب العالمین ہی تمام انسانوں کے ظاہری و باطنی معاملات غرضیکہ اس کائنات میں واقع ہونے والے چھوٹے بڑے تمام واقعات و حوادث وغیرہ سے باخبر ہے، کیونکہ وہی عالم الغیب والشہادہ ہے۔ وہ خود فرماتا ہے کہ اگر اس کائنات میں دو الٰہ ہوتے تو اس کا تمام نظام درہم برہم ہو جاتا۔۔۔ ادارہ]

۳) عقائد و اعمال کی بنیاد ہمیشہ عقلی و نقلی دلائل پر قائم ہونی چاہیے۔ ظنیات و توہمات یا خالی خولی جذباتی باتیں لائق توجہ تک نہیں ہیں، چہ جائیکہ ان پر مستقلاً اپنے عقائد و اعمال کی عمارت کھڑی کر لی جائے۔ پس جب یہ معلوم و مسلم ہے کہ تخلیق کائنات میں اللہ تعالیٰ نے کسی اور کو شریک نہیں کیا نہ اس نے قرآن کریم میں یا اس سے پہلے کی کسی کتاب میں شرک فی الدعا یا شرک فی العبادت کا حکم دیا ہے تو پھر لوگوں کو خود سوچنا چاہیے کہ ان کی ضلالت کا انجام کیا ہوگا!

یہ 'اولیاء پرستی' دراصل اس عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ انہیں نفع و نقصان پر قدرت حاصل ہے اور ان کے یہ اختیارات کچھ ایسے عالمگیر و ہمہ گیر ہیں کہ وہ اپنی کارروائیوں میں خود اللہ تعالیٰ کے اذن کے بھی پابند

نہیں، حتیٰ کہ اگر اللہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو یہ آڑے آتے اور بندوں کو اس سے بچا لیتے ہیں، اور فائدہ پہنچانا چاہے تو ان کی رضامندی کے بغیر وہ بندوں کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ یہی عقیدہ ان کی رضامندی و ناراضی کو اصل معیار قرار دیتا ہے اور کچھ پرواہ نہیں کی جاتی کہ اللہ تعالیٰ کس عمل سے خوش اور کس سے ناخوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ اس عقیدہ کی پرزور تردید کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:

﴿......قُلْ اَفَرَئَيْتُمْ مَّاتَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ﴾ (الزمر۳۹: آیت ۳۸)

''کہہ دو! ذرا دیکھو تو سہی کہ اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو تم اللہ کو چھوڑ کر جن جن کو پکارتے ہو کیا وہ اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں؟ یا اگر وہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟ تم کہہ دو کہ میرے لیے تو اللہ ہی کافی ہے، بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔''

سورۂ جن میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا﴾ (الجن۷۲: آیت ۲۱،۲۲)

''کہہ دو کہ میں تمہارے کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ تمہاری کسی بھلائی کا۔ تم کہہ دو کہ مجھ کو اللہ سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ پا سکتا ہوں!''

جو لوگ ''اولیاء'' کو اس درجہ نفع و نقصان پر قادر نہیں مانتے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے وہ پابند ہی نہ ہوں، انہیں شفاعت کا عقیدہ ایک اور رخ سے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان حضرات کو نفع و نقصان کے اختیارات دیئے گئے ہوں یا نہ دیئے گئے ہوں، بہر حال یہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں! اور جیسا کہ دنیوی سلطنتوں میں ہوا کرتا ہے، بسا اوقات ان سفارشیوں کو اصل حاکم سے زیادہ قدر و منزلت اور تعظیم کا مستحق ٹھہرا لیا جاتا ہے۔ کیونکہ انہی کی اچھی بری سفارشوں پر حاکم اعلیٰ کے سارے فیصلوں اور اس کی ساری کارروائیوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ کی بھی جگہ جگہ تردید کی ہے:

﴿......لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ......﴾ (الانعام۶: آیت ۵۱)

''اس کے سوا نہ ان کا کوئی مددگار ہے نہ کوئی سفارشی!''

﴿......لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ......﴾ (الانعام۶: آیت ۷۰)

''اللہ کے سوا نہ اس کا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارشی!''

﴿......مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ﴾ (السجدہ۳۲: آیت ۴)

''اس کے سوا نہ تمہارا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارشی۔ کیا تم نہیں سمجھتے؟''

﴿......مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ﴾ (غافر۴۰: آیت ۱۸)

''ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارشی جس کا کہا مانا جائے!''

﴿......وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ﴾

(الزمر۳۹: آیت ۳)

''جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز تجویز کر رکھے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہم ان کی عبادت محض اس لیے کرتے ہیں کہ وہ مرتبہ میں ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔ اللہ ان کے درمیان تمام مختلف فیہ معاملات کا فیصلہ کر دے گا۔ اللہ کسی ایسے شخص کو راہ راست نہیں دکھاتا جو جھوٹا اور ناشکرا ہو!''

﴿اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا......﴾ (الزمر۳۹: آیت ۴۳، ۴۴)

''کیا ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو سفارشی بنا رکھا ہے۔ کہو کہ اگرچہ یہ کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہوں اور کچھ نہ سمجھتے ہوں؟ تم کہہ دو کہ سفارش کا اختیار تو تمام تر اللہ ہی کو حاصل ہے!''

﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ (۱۰: آیت ۱۸)

''یہ اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کر رہے ہیں وہ نہ ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ (اے محمد ﷺ!) ان سے کہو: ''کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں۔'' اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں اللہ پاک اور بالا و برتر ہے!''

''شُفَعَآءَ'' کا عقیدہ رکھنے والے احمقوں کا آخری حسرت ناک انجام دیکھیے:

﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ﴾ (الانعام۶: آیت۹۴)

''بیشک تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا۔ جو کچھ ہم نے تم کو دنیا میں دیا تھا، وہ سب پیچھے چھوڑ آئے اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب (معبود) تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے!''

﴿......يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِن قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ قَدْ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾ (الاعراف۷: آیت۵۳)

''جس روز وہ انجام سامنے آ جائے گا تو وہی لوگ جو اس کو بھولے ہوئے تھے، کہنے لگیں گے کہ ''واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے۔ پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تا کہ جو کچھ پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقہ پر کام کر کے دکھائیں۔'' بیشک ان لوگوں نے اپنا نقصان خود کیا اور ان کی ساری افترا پردازیاں آج گئی گزری ہو گئیں۔''

﴿وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ○ وَلَمْ يَكُن لَّهُم مِّن شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ﴾ (الروم۳۰: آیت۱۲، ۱۳)

''جس روز قیامت برپا ہو گی تو مجرم سخت ناامید ہو جائیں گے۔ ان کے شریکوں میں کوئی ان کا سفارشی نہ ہو گا اور یہ لوگ اپنے شریکوں سے منکر ہو جائیں گے۔''

''شفاعت'' کا یہ عقیدہ چونکہ دوسروں کے لیے علم غیب کے حاصل ہونے کے عقیدہ کو مستلزم ہے، اس لیے قرآن نے اس کی بھی نفی کر دی ہے:

﴿وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ......الخ﴾ (الانعام۶: آیت۵۹)

''اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ......الخ﴾ (النمل ۲۷: آیت ۶۵)

''کہہ دو کہ سوائے اللہ کے زمین وآسمان کی کوئی ہستی غیب کا علم نہیں رکھتی۔''

﴿قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ......الخ﴾ (الاعراف ۷: آیت ۱۸۸)

''(اے محمد ﷺ!) تم کہہ دو کہ اللہ کی مشیت کے بغیر میں اپنی ذات کے نفع ونقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔ اگر میں عالم الغیب ہوتا تو یقیناً بہت سا نفع اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا!''

﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ......الخ﴾
(الاحقاف ۴۶: آیت ۹)

''(اے محمد ﷺ!) تم کہہ دو کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟''

یہ نبی ﷺ کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ ﷺ یہ کہہ دیں۔ چنانچہ نبی ﷺ نے بھی اپنی زبان مبارک سے یہی کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

''اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ خود میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ حالانکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔'' (مشکوۃ، باب البکاء والخوف حدیث ۵۳۴۰ بحوالہ بخاری بروایت ام علاء رضی)

یہ ''اولیاء پرستی'' بالعموم دو شکلوں میں ظہور کرتی رہی ہے: ایک یہ کہ اللہ پرستی کو بالکل ترک کر کے ''اولیاء پرستی'' ہی کو عین اللہ پرستی تصور کر لیا جاتا ہے اور دوسری یہ کہ اللہ پرستی کے ساتھ ساتھ ''اولیاء پرستی'' بھی چلتی رہتی ہے۔ چنانچہ ان دونوں تصورات کو رد کرنے کے لیے کہیں اللہ تعالیٰ نے ﴿تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو) فرمایا ہے اور کہیں ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کے بجائے ﴿مَعَ اللّٰهِ﴾ (اللہ کے ساتھ) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ مومنون کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُوْنَ﴾ (المومنون ۲۳: آیت ۱۱۷)

''جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے!''

سورۂ نمل کے پانچویں رکوع میں توحید کے دلائل دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بار بار اس سوال کو دوہرایا ہے کہ:

﴿ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ﴾

''کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے!''

چنانچہ ان آیات کے منجملہ ایک آیت یہ ہے:

﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ۭ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ﴾ (النمل ۲۷: آیت ۶۲)

''وہ کون ہے جو مجبور اور بے قرار آدمی کی دعا قبول کر لیتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور پھر اس کی مصیبت دور کر دیتا ہے اور تمہیں زمین میں نیابت کا شرف بخشتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے؟ مگر تم لوگ بہت کم نصیحت مانتے اور اسے بہت کم یاد رکھتے ہو!''

یہی غلط ذہنیت ہے جو زندہ اور مردہ ''بزرگوں'' کی تعظیم و تکریم میں غلو کرواتی اور بالآخر ان کی پرستش و عبودیت تک لے جا کر چھوڑ دیتی ہے۔ یہاں تک کہ زندوں سے کہیں زیادہ مُردوں کی پرستش کی جاتی ہے اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ قائم کر لیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد تصرفات میں اور اونچے ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اسی عقیدہ سے اہل قبور کے ساتھ وہ وہ کچھ کیا جاتا ہے جو زندہ ''بزرگوں'' کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اہل قبور کی پرستش کی بھی تردید فرمائی ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾ (النحل ۱۶: آیت ۲۰، ۲۱)

''اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں، بلکہ خود مخلوق ہیں۔ مردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں۔ اور ان کو کچھ معلوم نہیں کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا؟''

ان دونوں آیات میں خاص طور پر جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی گئی ہے وہ نہ تو فرشتے اور شیاطین ہیں اور نہ لکڑی پتھر کی مورتیاں، بلکہ صرف اصحاب قبور ہیں۔ کیونکہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں۔ ان پر ﴿اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ﴾ کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ رہ گئیں لکڑی پتھر کی مورتیاں! تو ان کے لیے شعور و عدم شعور کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے نہ بعث بعد الموت ہی ان سے متعلق ہے۔ لہٰذا ﴿الَّذِيْنَ

﴿ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ سے صرف وہ غیر معمولی انسان مراد ہیں جن کی وفات کے بعد غالی معتقدین انہیں داتا، مشکل کشا، فریادرس، بندہ نواز، غریب نواز، گنج بخش، دستگیر اور نہ معلوم کن کن القاب سے ملقب کر کے ان سے اپنی جملہ ضروریات وابستہ کر لیتے ہیں اور پھر انہیں اپنی ہر چھوٹی بڑی ضرورت یا مصیبت کے وقت پکارنے لگتے ہیں۔ نزول قرآن کے زمانہ میں بھی مردہ ''بزرگوں'' کی پرستش کا مرض بہت عام تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ اساف، نائلہ، لات، منات اور عزیٰ وغیرہ دراصل انسان تھے، جنہیں بعد کے جہلاء نے بت بناڈالا اور الوہیت کی صفات سے متصف کر دیا۔ آیت کریمہ ﴿ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا[1] ﴾ ''انہوں نے کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑ بیٹھنا اور نہ ود اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو چھوڑنا۔''

کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جو الفاظ صحیح بخاری میں مروی ہیں وہ یہ ہیں:

كلما اسماء رجال صالحين من قوم نوح عليه السلام فلما هلكوا اوحى الشيطان الى قومهم ان انصبوا الى مجالسهم التى كانوا يجلسون فيها انصابا وسموها باسمائهم ففعلوا فلم تعبد حتى اذا هلك اولئك ونسخ العلم عبدت

ترجمہ: ''یہ سب نوح (علیہ السلام) کی قوم کے نیک آدمیوں کے نام تھے۔ جب وہ لوگ مر گئے تو شیطان نے ان کی قوم کو یہ بات سجھائی کہ جہاں یہ لوگ بیٹھتے تھے وہاں کچھ نشان کھڑے کر لو اور ان کے نام ان بزرگوں کے ناموں پر رکھ لو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس وقت تو ان کی عبادت نہیں ہوئی مگر جب یہ لوگ مر گئے اور علم جاتا رہا تو ان کی عبادت ہونے لگی!'' (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، حدیث ۴۹۲۰)

اس روایت سے حسب ذیل امور بلا کسی تاویل وابہام کے خود بخود ثابت ہوتے ہیں:۔

1 رجال صالحین ہمیشہ پوجے جاتے رہے ہیں۔

2 صالحین کو معبود بنانا قطعی طور پر ''وحی شیطانی'' کا نتیجہ ہے۔ اس کو وحی الٰہی یا مرضیات الٰہی سے ذرہ برابر تعلق نہیں ہے!

3 صالحین کی نشست گاہوں، عبادت گاہوں اور رہائش گاہوں پر یادگاری نشان کھڑے کر دینا بھی صریحاً لغو فعل ہے!

4 استھانوں اور انصاب ونشانات کو ''بزرگوں'' کے نام سے موسوم کرنا بھی ''وحی شیطانی'' ہی کا نتیجہ

---

[1] نوح ۷۱: آیت ۲۳

ہے!

5 صالحین کی عبادت ان کی زندگی سے زیادہ ان کی وفات کے بعد ہوتی رہی ہے!

6 مردہ ''بزرگوں'' کی پرستش محض جہالت کا کرشمہ ہے۔ اس کو علم سے کوئی لگاؤ نہیں۔

نبی اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی اعلیٰ درجہ کی بصیرت سے خوب جانتے تھے کہ رجال صالحین تو دراصل اپنے پورے وجود کے ساتھ دوسرے لوگوں کو صالحیت کا سبق دیتے ہیں، مگر کمزور ذہن ان کی صالحیت کا الٹا اثر قبول کیا کرتے ہیں اور ان کی صالحیت رفتہ رفتہ الوہیت و معبودیت سے متصف کر دی جاتی ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے مختلف مواقع پر مختلف الفاظ اور عبارتوں میں اپنی امت کو قبروں کے ساتھ غیر معمولی اعتناء و اہتمام برتنے سے بار بار منع فرمایا ہے۔ مسلم شریف میں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو گچ سے پختہ کرنے، اس پر عمارت بنانے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔'' (مسلم، کتاب الجنائز)

ترمذی میں جابر رضی اللہ عنہ ہی سے منقول ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو گچ سے پختہ کرنے، ان پر لکھنے اور ان کو روندنے سے منع فرمایا۔''

(مسلم، کتاب الجنائز، سنن ترمذی، کتاب الجنائز، حدیث ۱۰۶۲)

ان دونوں حدیثوں پر غور کیجئے! بنظر ظاہر قبروں کو پختہ کرنے اور ان پر مقبرے اور گنبد تعمیر کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی، بلکہ بعض لوگوں نے تو اس کے فوائد و مصالح بیان کرنے کی بھی کوشش کی ہے، مگر نبی ﷺ خوب سمجھتے تھے کہ اگر اس اہتمام کا آغاز ہو گیا تو یہ اہتمام احترام تک اور احترام، سجدہ و طواف اور عبادت تک پہنچ کر رہے گا۔ اس لیے آپ ﷺ نے بالفاظ صریح اس سے منع کر دیا تا کہ ان راہوں کا سد باب ہی ہو جائے جہاں سے شرک دبے پاؤں داخل ہوتا ہے اور آگے چل کر خرافات و بدعات کا ایک طوفان اٹھا دیتا ہے۔ رہ گیا قبروں پر بیٹھنا اور ان پر لکھنا! تو ظاہر ہے کہ خالی خولی بیٹھنا یا صرف صاحب قبر کا نام اور تاریخ وفات وغیرہ لکھنا مراد نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ طلب حاجات کے لیے یا مراقبہ و مجاہدہ کی خاطر یا مجاور و خادم بن کر وہاں نہ بیٹھنا چاہیے۔ اور آیات و احادیث یا ایسے اشعار اور فقرے، جن میں صاحب قبر کی تعریف و ستائش نہایت مبالغہ کے ساتھ کی گئی ہو، لکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ سارے افعال بآسانی شرک و بدعت تک پہنچا دیتے ہیں! اور مقصود دراصل اسی راہ کو

بند کرنا ہے۔ چنانچہ قبروں کو پختہ کرنا تو ایک طرف رسول اللہ ﷺ کو اونچی قبریں تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔

ابوالھیاج اسدی کا بیان ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا:

''کیا میں تم کو ایسے کام کے لیے نہ بھیجوں جس کے لیے خود مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا اور وہ یہ ہے کہ تم کسی صورت (تصویر) کو مٹائے بغیر اور کسی اونچی قبر کو برابر کیے بغیر نہ چھوڑو۔''

(صحیح مسلم، کتاب الجنائز، حدیث ۲۲۴۳)

یہی تعلیم تھی جس کی بناء پر قبے اور عالیشان عمارتیں بنانا تو درکنار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی قبر پر معمولی سا شامیانہ سائبان تک دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ بخاری شریف میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے عبدالرحمٰن کی قبر پر ایک شامیانہ لگا ہوا دیکھا تو فرمایا کہ ''اے لڑکے! اس کو الگ کر دے، ان پر تو ان کا عمل سایہ کر رہا ہے۔''

ان شروعات کا راستہ جن جن مفاسد وقبائح تک پہنچتا ہے، ان کی نسبت بھی نبی ﷺ کے احکام نہایت صاف وصریح ہیں۔ مثلاً فرمایا:

''میری قبر کو ''عید'' (یعنی میلہ گاہ) نہ بناؤ۔''

(سنن نسائی، بحوالہ مشکوۃ المصابیح، باب الصلوۃ علی النبی ﷺ، حدیث ۹۲۶، وسندہ حسن الالبانی رحمہ اللہ)

ایک اور جگہ ہے:

''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا کہ پوجی جائے۔''

(مؤطا امام مالک رحمہ اللہ بحوالہ مشکوۃ المصابیح، باب المساجد ومواضع الصلوۃ، حدیث ۷۵۰۔ صحیح۔ الالبانی رحمہ اللہ)

قبروں کا بت بنا کر پوجا جانا تو ایک صاف وصریح بات ہے جس کی تشریح کی حاجت نہیں، البتہ لفظ ''عید'' کچھ تشریح طلب ہے۔ عید عربی لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو عود کرے یعنی بار بار آئے۔ چونکہ خوشی اور جشن کا روز سال بہ سال آتا رہتا ہے، اس لیے اسے بھی عید کہا جاتا ہے۔ عید بلا تعین روز و تاریخ نہیں آتی بلکہ اس کی ایک تاریخ معین ہوتی ہے، جس میں لوگ جمع ہوتے اور خوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

قرآن میں عیسیٰ علیہ السلام کی دعا منقول ہے کہ انہوں نے کہا تھا:

﴿...... اللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا ......﴾

(المائدہ ۵: آیت ۱۱۴)

''اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما تاکہ وہ ہمارے لیے

ہمارے اگلے پچھلے سب لوگوں کے لیے ایک خوشی کا دن قرار پائے۔"

یہود و نصاریٰ اپنے "بزرگوں" کی قبروں پر سال بہ سال جمع ہوتے اور میلے لگایا کرتے تھے۔ نبی آخر الزماں ﷺ نے اپنی امت کو حکم دیا کہ اس طرح روز و تاریخ معین کر کے میری قبر پر اجتماع نہ کرو جیسا کہ خوشی اور جشن کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ پھر دوسری حدیث میں وہ غرض بھی واضح فرمائی، جس کے لیے یہ میلے ٹھیلے اور اجتماعات منعقد ہوتے ہیں، یعنی قبر کو بت بنا کر پوجنا۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ جب نبی ﷺ ہی نے اپنی قبر پر میلوں اور اجتماعات کو پسند نہ فرمایا اور نہ یہ پسند کیا کہ قبر مبارک ایک بت بن کر رہ جائے جس کی پرستش ہوتی رہے، یہاں تک کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگی، تو پھر دوسروں کو یہ حق کہاں سے پہنچ سکتا ہے کہ ان کی قبریں بت بنا کر پوجی جائیں اور سال بہ سال نہایت شان و اہتمام کے ساتھ وہاں میلے اور "عرس" لگتے رہیں۔

اس امر واقعی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ افضل المرسلین و خاتم النبیین ہیں اور پوری کائنات میں اللہ تعالیٰ کے بعد آپ ﷺ ہی کی ہستی بزرگ ترین ہستی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور چیز کی عبادت جائز ہوتی اور "مزاروں" پر سالانہ اجتماعات کسی درجہ میں بھی محمود و مقصود یا کم از کم جائز ہوتے تو نبی ﷺ کی قبر اس کی اولین مستحق تھی۔ مگر جب نبی ﷺ نے خود اپنی ذات کے لیے بھی اس کی نفی فرما دی تو پھر کسی دوسری قبر کے لیے اس کا تصور تک کرنا ایمان کو متزلزل کرنے کے لیے ہے! رہ گئے اس کے لیے جواز و استحباب کرنے کی کوشش کرنے والے یا اسے ضروری اور لازم قرار دینے والے! تو نبی ﷺ کے صریح ارشادات کی روشنی میں ان کو اپنے ایمان کی خیر منانا چاہیے!

نبی ﷺ کے بعد پوری امت میں سب سے افضل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے۔ لیکن کسی صحابی کے متعلق یہ سننے میں نہیں آیا کہ ان کی قبر کو بھی بت بنا کر پوجا گیا ہے اور "عرس" کے نام سے وہاں سالانہ اجتماع منعقد ہوتا رہا ہے۔ پس پوری امت میں سے چند مخصوص "اولیاء و صوفیاء" کی قبروں کے ساتھ یہ سارا معاملہ بین طور پر انتہائی فساد عقیدہ کا مظہر ہے، جس سے ہر متبع شریعت مسلمان کو توبہ کرنی چاہیے!

قبروں کی عبادت کا ایک جزو اور نہایت اہم جزو یہ ہے کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی نبی اکرم ﷺ کے ارشادات نہایت واضح ہیں۔ مثلاً عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا تھا:

''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائے۔انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔''
(صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث ۴۴۴۱۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد)

یہی ارشاد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے بھی منقول ہے، جسے بخاری و مسلم کے علاوہ ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ مشکوٰۃ کے مذکورہ بالا باب میں مسلم کے حوالے سے ایک اور حدیث نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''خبردار ہو! تم سے پہلے کے لوگ اپنے انبیاء و صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے۔ پس تم کہیں قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنا لینا، میں تمھیں اس فعل سے منع کرتا ہوں!''
(مسلم، کتاب الجنائز۔ ابن ابی شیبہ (۱۴۴/۴)، مسند احمد ۳۳۹/۳، ۳۹۹)

یہاں یہ امر بھی لائق ذکر ہے کہ انبیاء علیہم السلام و صالحین کی قبروں کو سجدہ کرنا تو ایک طرف خود امام الانبیاء ﷺ نے اپنی زندگی میں اپنی ذات گرامی کے لیے بھی سجدہ کو جائز نہیں رکھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ مہاجرین اور انصار کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک اونٹ آیا اور اس نے نبی (ﷺ) کو سجدہ کیا۔ اس پر اصحاب رضی اللہ عنہم نے کہا کہ:

''جانور اور درخت آپ کو سجدہ کرتے ہیں، پس ہم تو آپ ﷺ کو سجدہ کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔'' (مسند احمد ۷۶/۶۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔)

آپ ﷺ نے فرمایا:

''عبادت صرف اپنے رب کی کرو۔ رہ گیا تمھارا بھائی تو اس کا صرف اکرام کیا کرو۔''

اس حدیث میں عبادت اور اکرام کا فرق بھی بتا دیا گیا ہے۔ اور رب کے مقابلہ میں دوسرے سارے انسانوں کو ''بھائی'' کہہ کر یہ امر بھی ذہن نشین کر دیا گیا ہے کہ ان میں باہمی کتنا ہی فرق مراتب ہو، بہر حال وہ عبدیت کے رشتہ سے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس ان کا اکرام تو جائز ہے لیکن اس میں غلو کر کے عبادت تک نوبت پہنچا دینا فی الجملہ حرام ہے!

جو قبریں سجدہ گاہ تک کا مرتبہ حاصل کر چکی ہوں، ناممکن ہے کہ لوگ ان پر دور دراز سے سفر کر کے اور سفر کا ساز و سامان ساتھ لیے نہایت اہتمام کے ساتھ حاضری نہ دیں۔ چنانچہ ''اسفار زیارت'' کا رواج عہد جاہلیت میں بھی تھا اور آج بھی اس کا مشاہدہ ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ نبی ﷺ نے اسے ممنوع قرار دیتے ہوئے صاف فرمایا کہ:

[آج بھی ایران، عراق، شام اور ترکی وغیرہ کی ''زیارات'' کا ڈھونگ رچا کر بعض لوگ، علمۃ الناس (جن کی اکثریت دین سے نابلد ہوتی ہے) کو قافلوں کی صورت میں وہاں لے جا کر گمراہ بھی کرتے ہیں اور ان کے مال وزر سے اپنے دامن بھی بھرتے ہیں، اعاذنا اللہ منہ! ---ادارہ]

''زیارت کے واسطے کسی استھان یا مکان متبرک کو سفر کر کے جانا درست نہیں ہے۔ اس قسم کا سفر صرف تین مسجدوں کے لیے جائز ہے: ایک مسجد حرام یعنی بیت اللہ شریف، دوسری مسجد اقصیٰ، تیسری مسجد نبوی۔'' (صحیح بخاری وصحیح مسلم، بحوالہ مشکوۃ المصابیح، باب المساجد ومواضع الصلوۃ، حدیث ۶۹۳)

اس حدیث سے اسفار زیارت کی نوعیت خود بخود متعین ہو جاتی ہے!

جو لوگ ان تمام تنبیہات کے باوجود ''زیارت قبر'' کے نام سے ''عبادت قبر'' کرتے ہیں وہ دیدہ ودانستہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اس معاملہ میں مرد وعورت دونوں یکساں ہیں لیکن ''زائرین'' کے مقابلہ میں ''زائرات'' کے لیے اعتقادی واخلاقی فتنوں میں مبتلا ہونے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان پر نبی ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ ابوداؤد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''لعن رسول الله زائرات القبور۔'' (سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، حدیث ۳۲۳۶) احمد، ترمذی اور ابن ماجہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''لعن الله زوارات القبور۔''

(صحیح سنن الترمذی، کتاب الجنائز، حدیث ۱۰۶۷۔ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث ۱۵۷۶ مسند احمد، ج ۲ ص ۳۳۷، ۳۵۶)

[دونوں احادیث کا (ترجمہ) ''اللہ تعالیٰ قبروں کی ''زیارت'' کرنے والی عورتوں پر لعنت کرے۔'' ---ادارہ]

اوپر کی توضیحات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قبر پرستی اور ''اولیاء پرستی'' بالیقین ''شرک'' کی تعریف میں داخل ہے۔ لہٰذا اب شرک کی اہمیت بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے:

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے جناب لقمان کی جو نصیحتیں نقل فرمائی ہیں، ان میں ایک فقرہ یہ ہے:

﴿يَابُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (لقمن ۳۱: آیت ۱۳)

''بیٹا! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ بلاشبہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔''

[حکیم لقمان چونکہ بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے اس لیے اس کی فہم وذکا کے مطابق انہوں نے شرک کو صرف ظلم عظیم کہہ کر چھوڑ دیا مگر رسول اکرم ﷺ نے اپنی امت کے ایک ایک فرد کو بلا لحاظ خرد وکلاں وبلا لحاظ عام وخاص جو نصیحت فرمائی ہے وہ سننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں ((لا تشرك بالله وان قتلت وحرقت)) ''اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرانا اگرچہ تو قتل کر دیا جائے یا جلا دیا

جائے!'' (مشکوٰۃ، باب الکبائر، بحوالہ احمد، بروایت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ]

قرآن میں ''ظلم'' بالعموم گناہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پس شرک اس لحاظ سے سب سے بڑا گناہ قرار پاتا ہے۔ قرآن ہی بتاتا ہے کہ اس گناہ کی حیثیت دوسرے گناہوں سے بالکل مختلف ہے۔ دوسرے گناہ چاہے وہ بجائے خود کتنے ہی بڑے ہوں لائق معافی ہیں، لیکن شرک بالکل نا قابل معافی جرم ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى إِثْمًا عَظِيْمًا﴾ (النساء۴: آیت ۴۸)

''یقیناً اللہ اس بات کو معاف نہیں کرے گا کہ (کسی کو) اس کا شریک بنایا جائے۔ ہاں اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں انہیں وہ جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا۔ کیونکہ جس نے (کسی کو) اللہ کا شریک قرار دیا اس نے ایک بڑا گناہ افترا کیا!''

[ایک حدیث قدسی میں یہی مضمون ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: یا ابن آدم انک او لقیتنی بقراب الارض خطایا ثم لقیتنی لاتشرک بی شیئا الا اتیتک بقرابها مغفرة (مشکوٰۃ، باب الاستغفار بحوالہ ترمذی، بروایت انس رضی اللہ عنہ) ''اے ابن آدم! جب تو مجھ سے ملے تو چاہے زمین بھر گناہوں کا بوجھ لیے ہوئے ہو مگر مجھ سے اس حالت میں ملے کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک قرار نہ دے تو یقیناً میں تیرے پاس زمین بھر بخشش لے آؤں!'']

حکیم لقمان کی نصیحت میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے اسے اثم عظیم فرمایا ہے اور اس پر لفظ ''افترا'' کا اضافہ کیا ہے، جو جھوٹ تصنیف کرنے کا ہم معنی ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دوسرے گناہ تو کسی نہ کسی عارضی سبب سے سرزد ہوا کرتے ہیں لیکن شرک کی سرے سے کوئی علت ہی موجود نہیں۔ یہ محض انسان کے توہم پرستانہ ذہن کی خلاقی ہے۔ آیت شریفہ میں ﴿مَا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ گناہوں کی معافی کا جو اعلان کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی بس شرک سے بچا رہے اور باقی دوسرے گناہ خوب دل کھول کر کیے جائیں بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک کو ایک بہت معمولی گناہ نہ سمجھا جائے۔ یہ تو تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے، یہاں تک کہ دوسرے گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ گناہ قطعی طور پر نا قابل معافی ہے۔ اس سے ان لوگوں کا برسر غلط ہونا پوری طرح واضح ہوتا ہے جو شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے ہیں بلکہ ان کا سارا وقت فقیہانہ جزئیات کی ناپ تول ہی میں صرف ہوتا رہتا ہے، لیکن شرک ان کی نگاہ میں اتنا ہلکا فعل ہے کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس سے بچانے کی

کوشش کرتے ہیں، بلکہ طرح طرح کی تاویلوں اور تحریفوں سے شرک کو توحید کا لباس پہنانے میں بھی تامل نہیں کرتے اور تحریف کا کمال یہ ہے کہ شرک خفی کو شرک خفیف تک بنا ڈالتے ہیں۔

اسی سورۃ النساء میں چند رکوع آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا﴾ (النساء۴: آیت ۱۱۶)

''یقیناً اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرے گا، البتہ اس کو چھوڑ کر دوسرے گناہ جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا۔ جو شخص (کسی کو) اللہ کا شریک قرار دیتا ہے وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا!''

یعنی دوسرے گناہوں کے ارتکاب میں بھی آدمی وقتی طور پر راہ ہدایت سے انحراف کر جاتا ہے لیکن اس کی نوعیت کیچڑ سے بھری ہوئی چکنی زمین پر چلنے والے کی لغزش کی سی ہوتی ہے، برخلاف اس کے ایک مشرک راہ ہدایت سے ہٹ کر اتنی دور نکل جاتا ہے کہ ضلالت کے جنگل ہی میں سرگشتہ و حیران ہو کر رہ جاتا ہے اور راہ ہدایت اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں اس کی سرگشتگی اس کی مستقل تباہی پر ختم ہوتی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو نہایت بلیغ الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

سورۃ الحج میں ہے:

﴿......وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴾ (الحج۲۲: آیت ۳۱)

''جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے وہ گویا آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اسے پرندے اچک کر لے جائیں گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کی ہڈیاں پس کر رہ جائیں گی!''

یہ تو مشرک کا دنیوی انجام ہے، رہ گیا اخروی انجام! تو سورۃ المائدہ میں فرمایا کہ:

﴿......اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ (المائدہ۵: آیت ۷۲)

''جو شخص (کسی کو) اللہ کا شریک قرار دیتا ہے، اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا آگ (یعنی جہنم) ہے، ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں!''

یہی شرک ہے جس کے متعلق سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے کم و بیش اٹھارہ پیغمبروں کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ﴿وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الانعام۶: آیت ۸۸)

''اگر ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا کیا کرایا سب غارت ہو جاتا!''

ہم پوچھتے ہیں کہ شرک سے متعلق اس سے زیادہ تصریحات اور کیا ہو سکتی ہیں! جب انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ جماعت کے اعمال بھی شرک کی وجہ سے قابل حبط قرار پا سکتے ہیں (حالانکہ ان سے شرک کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا) تو وہ دوسرے کون ہیں جنھیں ''شرک'' کے بعد اپنے اعمال کی کوئی جزا ملنے یا سزا سے بچ رہنے کا اطمینان حاصل ہے۔ شرک تو ظلم عظیم ہے اور ایسے تمام ظالموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ ان کا کوئی مددگار نہیں۔ اب نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مقابلہ میں کس کے ''ارشادات'' ظالموں کو کہیں سے مدد پہنچنے کا یقین دلا رہے ہیں؟

سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر قبر پرستی، ''اولیاء پرستی'' اور اس کے سارے لوازم و مقتضیات شرک یا قریب بہ شرک یا شرک کی طرف لے جانے والے وسائل و ذرائع ہیں، تو پھر قرآن و حدیث کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں خود مسلمانوں کے اندر اس کا کثرت شیوع اس حد تک کیسے پہنچ گیا کہ آج شاید کوئی شہر، کوئی قصبہ اور کوئی گاؤں ایسا نہیں جو اس کی پرچھائیں سے محفوظ رہا ہو۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ﴿......لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ......﴾[1] ''پاک اور ناپاک بہر حال یکساں نہیں ہیں، اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہارے لیے کتنی ہی تعجب انگیز ہو۔'' اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ علم دین کی کمی اور انتہائی کمی کی وجہ سے ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ اس معاملہ کے بہت سے تاریخی، نفسیاتی اور داخلی و خارجی اسباب بھی ہیں، جن کی طرف ہم یہاں مختصراً اشارہ کیے دیتے ہیں۔

مسلمانانِ ہند کی پچھلی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام کسی منظم کوشش کے نتیجہ میں نہیں پھیلا۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر عمومی حالت یہ رہی ہے کہ بالکل ایک غیر منظم طریقہ سے کہیں کوئی صاحب علم آ گئے، جن کے اثر سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے۔ کہیں کوئی تاجر پہنچ گیا، جس کے ساتھ ربط ضبط رکھنے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا اور کہیں کوئی نیک نفس اشخاص تشریف لے آئے، جن کے بلند اخلاق اور پاکیزہ زندگی کو دیکھ کر بہت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس حالت میں ضروری تھا کہ جو لوگ مسلمان ہوتے چلے گئے ان کے فکر و عمل میں وہ پورا انقلاب لایا جاتا جو اسلام میں مطلوب ہے۔ کیونکہ تاریخ و نفسیات پر اور بالخصوص اسلام و جاہلیت کی کشمکش پر جن لوگوں کی

---

[1] المائدہ ۵: آیت ۱۰۰

نظر ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی دوسرے مذہب سے نکل کر اسلام میں آ جانا جتنا آسان ہے، اعتقادات وخیالات سے لے کر رسوم واعمال تک کے ایک ایک گوشہ میں پوری طرح اسلامی روح کو جذب کرنا اتنا آسان نہیں ہے!

[برصغیر پاک وہند میں ابتداً اسلام بہ توفیق الٰہی عرب تاجروں کی انفرادی کوششوں سے پھیلا، جو نہ صرف توحید کی روح اور تعلیم کو سمجھتے تھے بلکہ دین کی دیگر تعلیمات اور عقائد پر بھی ان کی نظر تھی۔ یوں اسلام کی خالص اور شفاف تعلیمات پھیلیں۔ پھر بتدریج ہندوؤں کی ''جوگیانہ تہذیب'' کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی ''صوفیاء'' اور ''مشائخ'' کے بعض مخصوص طبقے پیدا ہوتے چلے گئے جو ہندوؤں کی مشرکانہ تہذیب کے افکار ونظریات سے متاثر ہو کر ان کے رنگ میں ہی رنگتے چلے گئے۔ اس کے بعد برصغیر پاک وہند میں جو اسلام تیزی سے پھیلا، وہ وہی ''اسلام'' تھا جس کی ''مسلمان صوفیاء'' نے تبلیغ واشاعت کی اور جس میں شرک وبدعات اور دیگر خرافات کی خاصی روح موجود تھی۔ پھر باقاعدہ ایک مہم اور مشن کے تحت اس بات کا پراپیگنڈہ کیا گیا اور اب بھی کیا جارہا ہے کہ برصغیر پاک وہند میں اسلام ''صوفیاء'' نے پھیلایا۔ حالانکہ یہ ۱۰۰ فیصد جھوٹ ہے۔ ''صوفیا'' نے تو اپنی کم علمی کے باعث دانستہ یا نادانستہ اس خالص اسلام میں شرکیہ اور بدعی تعلیمات کو فروغ دیا، جس کی عرب تاجروں نے یہاں تبلیغ واشاعت کی تھی۔۔۔ ادارہ]

اس کے لیے باقاعدہ تعلیم وتربیت اور ایک مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے اور خود نبی ﷺ کی تبلیغ دین اور سعی اصلاح اس پر شاہد ہے کہ جاہلیت سے نکل کر آنے والے لوگوں کو اسلام کے معیار مطلوب تک پہنچانے کے لیے آپ ﷺ نے مستقل اور مسلسل کتنی توجہ فرمائی اور اس کے باوجود عرب کے ابتدائی معاشرے میں کبھی کبھار جاہلی فکر ابھر آتی تھی۔ یہ منظم اور انتھک جدوجہد کی ضرورت اس ملک اور اس معاشرہ میں اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے، جہاں مشرکانہ عقائد اور مشرکانہ خیالات وتوہمات دل ودماغ میں خوب گہرے اترے ہوئے ہوں اور مشرکانہ اعمال ورسوم انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ کو پوری طرح اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہوں۔ اس لحاظ سے سرزمین ہند جو حیثیت رکھتی ہے اس سے کون واقف نہیں۔ پس یہ نہایت ضروری تھا کہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس کے استحکام کا اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہتمام کیا جاتا۔

اسلام پھیلانے والے افراد کی مساعی جمیلہ کو پوری طرح کامیاب بنانے کے لیے عین ضروری تھا کہ وقت کی حکومتیں ان کے ساتھ تعاون کرتیں اور دوسرے مذاہب سے نکل نکل کر آنے والے تمام مسلمان فرداً فرداً نہ سہی، کم از کم اپنی ایک معتدبہ اکثریت کے ساتھ انفرادی واجتماعی حیثیت سے اسلام میں پوری طرح جذب ہو جاتے۔ اسلامی حکومت تو غیر مسلموں کے لیے دعوت اسلام کا ایک بہترین عملی مظہر اور مسلمانوں کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک منظم ادارہ ہوا کرتی ہے۔ اس لیے مسلم

حکمرانوں کا کام یہ تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ سے اسلام کی توسیع کی اور نظام تعلیم ونظام قانون وسیاست کے ذریعہ سے اسلام کے استحکام کی کوشش کرتے مگر یہاں جو لوگ فتح وظفر کے جھنڈے اڑائے درہ خیبر سے آگے بڑھے اور اندرون ملک چاروں طرف پھیل گئے، وہ خود نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اسلام بھی اس وقت لائے تھے جب خود اس کے تہذیبی مرکزوں (حجاز، عراق اور شام وغیرہ) میں انحطاط رونما ہو چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ملک گیری اور کشور کشائی ہی کو زیادہ تر اپنا نصب العین بنا لیا اور دنیوی عیش وتنعم ہی کو بہت کچھ سمجھ بیٹھے۔ اس صورت حال میں ان کی حکومتیں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا معیاری ادارہ نہیں بن سکتی تھیں اور نہ بنیں!

یہ حکومتیں اسلامی دعوت وتبلیغ کا کام تو کیا انجام دیتیں! اللہ کے جن بندوں نے یہ کام شروع کر رکھا تھا اور جس کے لیے انہوں نے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں، ان کے ساتھ تعاون تک نہ کیا بلکہ کتنے ہی وقتوں اور موقعوں پر وہ اپنے سارے وسائل وذرائع اور اپنے سارے حاکمانہ اختیارات کے ساتھ ان کی راہ میں حائل ہوئیں اور ان بیچاروں کو درباری اثر ورسوخ اور شاہی اقتدار کا سخت مقابلہ کر کر کے اپنا کام جاری رکھنا پڑا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہ سخت سے سخت مظالم کا تختہ مشق بنے اور طرح طرح کی سختیاں جھیلتے رہے۔ اگرچہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہونے والے سارے ہی مسلمان بادشاہ نااہل ونا کارہ اور فاسق وفاجر نہیں تھے۔ ان میں شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود، محمد تغلق، فیروز تغلق، سکندر لودھی اور ایسے ہی بعض دوسرے بادشاہ بھی گزرے ہیں، جنہوں نے نیکی اور پاکیزگی کے لحاظ سے تاریخ میں ایک خاص مقام پیدا کیا ہے۔ لیکن ان کی دینداری اول تو شخصی دینداری تھی، دوسرے انہوں نے شرک کو مٹانے اور توحید کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے تعلیم وتربیت اور تنفیذ قوانین الٰہیہ کی جو کوششیں کیں وہ مسلمانوں کی روز افزوں آبادی میں ان کے ایک ایک فرد کے اندر شرک کے جراثیم کو پوری طرح ہلاک کر دینے کے لیے کافی نہیں تھیں۔ پھر موروثی شاہی نظام ان کے پوری طرح کامیاب ہونے میں بھی مانع تھا۔ کیونکہ آئے دن اچھے اور برے افراد کا ادل بدل ہر اصلاحی کوشش پر اثر انداز ہوتا اور یہ کوششیں اپنے پورے نتائج تک پہنچنے بھی نہ پاتیں کہ اس طرح ختم کر دی جاتیں جیسے یہاں دین کی خدمت اور اصلاح حال کا کوئی کام کیا ہی نہیں گیا۔ اس لیے شرک اپنے پر پرزے نکالتا ہی رہا اور اس کی سمیت سے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کا ذہن متاثر ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ایک وہ دور بھی آ گیا کہ ''شرک'' کو باقاعدہ سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی! انا للہ وانا الیہ راجعون!

یہ مغلیہ خاندان کے مشہور بادشاہ اکبر کا دور تھا۔ جس میں اگر کائناتی قیامت نہ آئی نہ سہی، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دین اسلام پر قیامت آ گئی۔ یہ شخص ان پڑھ تھا اور اس کے درباری ومصاحب سخت گم کردہ راہ۔ اس کے منحوس دور میں نہ صرف یہ کہ اسلام کے دائرہ میں شرک اپنے عالم آشوب ناز وانداز کے ساتھ پورے کبر وافتخار کا مظاہرہ کرتے ہوئے داخل ہوا بلکہ سرے سے دین اسلام ہی پر خط تنسیخ پھر گیا۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک محضر نامہ پیش کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ:

''بادشاہ ظل اللہ ہے، مہدی ہے، صاحب زماں ہے، امام عادل ہے، مجتہد العصر ہے، وہ کسی کا پابند نہیں، اس کا حکم سب پر بالا ہے۔''

چنانچہ اسے معصومیت کی سند دے دی گئی اور وہ اپنی عقل کو بھی معصوم سمجھنے لگا۔ ایک صاحب تو یہاں تک بڑھے کہ اکبر کو اللہ تعالیٰ کا عکس ہی ٹھہرا دیا (معاذ اللہ)! بس پھر کیا تھا ایک نئے دین کی نیو پڑ گئی۔ اس نئے دین کا نام برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق دین الٰہی رکھا گیا اور اس کا کلمہ لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ تجویز کیا گیا۔ جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے، ان کو ''دین اسلام مجازی وتقلیدی کہ از پدراں دیدہ وشنیدہ ام'' سے توبہ کرنی پڑتی اور ان کو لفظ ''چیلہ'' سے تعبیر کیا جاتا۔ بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں سے ایک رکن تھی۔ ''چیلوں'' کو بادشاہ کی تصویر دی جاتی جسے وہ پگڑی میں لگاتے۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری دی جاتی تو اس کے سامنے سجدہ بجالایا جاتا۔ درباری علماء و ''صوفیاء'' بے تکلف سجدہ کرتے اور اس صریح شرک کو ''سجدۂ تحتیہ'' اور ''زمین بوسی'' جیسے الفاظ کے پردہ میں چھپاتے۔ اکبری محل میں دائمی آگ کا الاؤ روشن کیا گیا اور چراغ روشن کرنے کے وقت قیام تعظیمی کیا جانے لگا۔ مریم علیہا السلام کو بھی معبود بنایا گیا اور ستاروں کی پرستش بھی کی گئی۔ خود اکبر نے مشرک عورتوں سے شادیاں کیں، جس کی وجہ سے قصر شاہی میں ہندو تہذیب و معاشرت کا سکہ چلنے لگا۔ ان کے لیے قصر میں خاص عبادت خانے بنائے گئے اور بتوں کی پوجا کا باقاعدہ انتظام ہوا۔ ہندو تہوار دیوالی، دسہرہ، راکھی پونم، شیوراتری وغیرہ پوری ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ شاہی محل میں ہون کی رسم ادا کی جانے لگی۔ دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ناموں کا جاپ کیا جاتا۔ آفتاب کا نام زبان پر آتا تو ''جلت قدرتہ'' کے الفاظ کہے جاتے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ دوش وکمر پر جنیوڈالا جاتا اور گائے کی تعظیم کی جاتی!

اب آپ ایک طرف اکبری حدود سلطنت اور حکومت کی اسلام دشمنی پر نظر کیجیے اور دوسری طرف ان

کروڑوں مسلمانوں کا تصور کیجیے جو لاکھوں مربع میل زمین میں پھیلے ہوئے اپنے غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ اور پھر اندازہ لگایئے کہ جب ایک عظیم الشان شاہی حکومت کفر و شرک کی علمبردار ہو تو لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی باقاعدہ دینی تعلیم و تربیت اور ان کی مکمل ذہنی اصلاح کے لیے ان چند علماء حق کی کوششیں کس حد تک مفید ہو سکتی ہیں جو حکومت کے ذرائع و وسائل سے نہ صرف محروم ہوں بلکہ ان کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے متفرق طور پر اپنا کام کر رہے ہوں!

کم و بیش ربع صدی تک ''دین الٰہی'' کی قاہرانہ سرپرستی کر کے جب اکبر دنیا سے رخصت ہوا تو جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ تعزیر و سیاست میں اس کا عدل عام طور پر مشہور ہے، لیکن اُس کا بھی یہی حال تھا جو اکبر کا تھا۔

جہاں تک اقامت توحید، ازالہ شرک، احیاء سنت اور امحاء بدعت کا تعلق ہے، نہ صرف شخصی زندگی میں بلکہ حکومت کے تمام ممکنہ وسائل و ذرائع کے ساتھ پوری اجتماعی زندگی میں مغل حکمرانوں میں اس کی مکمل جدوجہد کرنے والی صرف ایک ہی شخصیت تھی اور وہ ہے عالمگیر کی شخصیت۔ عالمگیر نے مشرکانہ خیالات و نظریات کی اصلاح کرنے اور مشرکانہ رسوم و رواجات کو دیس نکالا دینے کے لیے نصف صدی تک جہاد کیا۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کی حکومت بھی موروثی حکومت تھی، اس لیے ان کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کے نااہل اور بدکار جانشینوں نے ان کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

آپ اس وقت سے لے کر مسلم حکومت کے خاتمہ تک تخت دہلی پر بیٹھنے والے بادشاہوں کے حالات و خیالات کا مطالعہ کریں، تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس وقت ہندوستان پر جہالت کی شدید تاریکی مسلط تھی۔ اس زمانہ میں نہ صرف اعتقادی خرابیاں پرورش پاتی رہیں بلکہ اخلاقی بے حیائیوں اور بے راہ رویوں کا بھی وہ طوفان اٹھا کہ اس نے مسلمانوں کے پورے نظام اجتماعی کو تہ و بالا کر ڈالا۔ اس زمانہ میں خرج و شکم کی جس جس طرح پوجا کی گئی اور سلاطین و امراء نے بدکاریوں اور بداخلاقیوں کے جس جس طرح مظاہرے کیے، ان کے تذکرے تاریخ کے اوراق میں پڑھ کر ایک مسلمان کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے دنیوی فوائد و لذائذ ہی کو معبود بنا کر پوجا ہو، انہیں شرک و توحید کی بحث سے کیا تعلق رہ سکتا ہے۔ اگر قبریں پج رہی ہوں تو کیا مضائقہ ہے، اگر ''اولیاء'' پوجے جا رہے ہوں تو کیا برائی ہے۔ اگر مشرکانہ بدعات کا زور ہے تو ان کا کیا بگڑتا ہے۔ اگر شرک نے پھیل کر پوری

زندگی کو لپیٹ میں لے لیا ہے تو اس سے ان کا کیا نقصان ہے۔ چنانچہ یہی صورت حال تھی جس میں قانون الٰہی کے مطابق مسلمانوں کو تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا اور ایک غیر مسلم قوم نے چیرہ دست ہو کر اپنی حکومت کے لادینی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے نہ صرف مذہب کے دائرہ کو سیاست سے الگ کر لیا، بلکہ اپنے نظام تعلیم و تربیت، اپنے نظام تہذیب و تمدن اور اپنے نظام معیشت و معاشرت کے تسلط سے کروڑہا کروڑ مسلمانوں کو دین سے بیگانہ بنا ڈالا۔

پھر جب اس قوم کا تسلط ختم ہوا اور یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو جس حصہ ملک پر ہندو حکمران ہو گئے وہ تو بہر حال شرک سے پاک نہیں ہو سکتا، مگر جس حصہ پر مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہوئی، وہاں بھی انتہائی منظم اور باقاعدہ اصلاحی کوششوں اور ہر طرح کی قربانیوں کے باوجود نو دس سال ہو گئے ہیں ابھی وہ اصلاح نہیں ہو سکی جس کے نتیجہ میں شرک اور اس کے لوازمات کو پوری طرح ملک بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو گمراہیاں صدیوں تک پلتی اور بڑھتی چلی جاتی ہیں انہیں قدامت کی وجہ سے خواہ مخواہ تقدس اور بزرگی کا مقام حاصل ہوتا چلا جاتا ہے اور ان کی اصلاح کا کام بھی اسی مناسبت سے نہایت مشکل اور دیر طلب ہوتا ہے!

[اب اس مدت کو چون، پچپن سال پڑھا جائے۔ قیام پاکستان کو اب اتنا عرصہ ہو گیا ہے---ادارہ]

[پاکستان میں شرک و بدعات اور ان کے لوازمات کا خاتمہ تو کجا، یہ برائیاں بڑھ چڑھ کر اب عام ہو گئی ہیں اور انتہائی بدقسمتی یہ ہے کہ مجموعی طور پر عوام الناس میں چوری، ڈاکہ، زنا وغیرہ تو برائیاں شمار کی جاتی ہیں مگر شرک اور بدعات کی نہ ان کو پہچان ہے نہ وہ ان کو برائیاں سمجھتے ہیں، العیاذ باللہ!---ادارہ]

ان گمراہیوں کی شراب کو جس چیز نے دو آتشہ بلکہ ہزار آتشہ بنا دیا وہ بندۂ زر علماء اور دنیا پسند ''صوفیاء'' کا وجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ لوگ ان گمراہیوں کی حمایت کرنے، شرک پر توحید کا پردہ ڈالنے، بدعت کو سنت بنانے اور مشرکانہ طور طریقوں کو سند جواز دینے کے لیے موجود نہ رہتے تو مسلمانوں کو غلط کار حکمرانوں اور غیر اسلامی حکومتوں سے جتنا نقصان پہنچا اس کا آدھا حصہ بھی نہ پہنچتا۔ انہوں نے عوام کو بھی گمراہ کیا اور حکومتوں کو بھی غلط راستہ پر ڈالا۔ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ جہاں چند علماء حق دین اسلام کی اقامت و حمایت میں جانیں لڑا رہے ہیں وہی ایسے مولوی اور ''صوفی'' بھی موجود ہیں جو ''جی حضوری'' بن کر اہل جاہ و منصب اور ارباب اقتدار و حکومت کی غلط بینی و غلط کاری میں ان کے ساتھ ہیں۔ انہی کی سازشوں سے اہل حق پر بڑی بڑی آفتیں آئیں اور وہ سخت

سے سخت مصیبتوں میں گرفتار ہوئے۔ اگر یہ ظالم ضلالتوں سے صرف رواداری برتتے یا گمراہوں اور غلط کاروں کا صرف ساتھ دینے پر اکتفا کرتے تو یہ بھی کسی بڑے مفسدہ کا موجب نہ تھا، مگر انہوں نے عوام اور اہل حکومت دونوں کے اندر اپنا تقدس قائم کرنے اور ان کو ان کی ضلالتوں پر مطمئن کر دینے کے لیے قرآن وحدیث کو بھی خوب خوب استعمال کیا۔ چونکہ یہ عوام اور اہل حکومت کے رہنما نہیں رہے ہیں بلکہ ان کا کام صرف ان کی چشم وابرو کی طرف دیکھنا اور ان کی شہوات ومرضیات کا اتباع کرنا ہی رہا ہے، اس لیے جو جو کچھ وہ کہتے اور کرتے رہے یہ قرآن وحدیث کی رو سے اسے جائز بتاتے رہے۔ آیات وحدیث کو توڑنے مروڑنے اور انہیں اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا اور جہاں اس کی بھی گنجائش نظر آئی، وہاں ضعیف وموضوع روایات اور من گھڑت کہانیوں کا سہارا ڈھونڈا اور اس کا بھی ایسا انبار لگایا کہ حق کا علم اس کے نیچے دب کر ہی رہ گیا۔ کہیں باطل کو حق کا رنگ دیا گیا اور کہیں حق وباطل کو ایسا گڈمڈ کر دیا گیا کہ لوگوں کے لیے حق کی صورت پہچاننا مشکل ہو گیا۔

اس قماش کے لوگوں کے تمام "کارناموں" کو چھوڑ کر اگر صرف ان کی تحریری وتصنیفی کاوشوں پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ چھوٹے چھوٹے رسالوں سے لے کر بڑی بڑی کتابوں بلکہ قرآن کی تفسیروں تک انہوں نے اتنا زبردست لٹریچر مہیا کر دیا ہے کہ آج جو بات کسی جاہل کے منہ سے نکلتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی غیر معقول اور بیہودہ ہو اور جو کام جاہل لوگ کرتے ہیں، چاہے وہ کتنا ہی غلط اور بے ڈھنگا ہو، اس کی تائید وتصویب میں بآسانی پچاسوں تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہی تحریریں لوگوں کا مرجع ہیں اور چونکہ ان تحریروں میں قرآن وحدیث کا نام بھی بار بار آتا ہے، اس لیے لوگوں کو اس بات کا پورا اطمینان حاصل ہے کہ جو کچھ وہ کہہ اور کر رہے ہیں وہ ہرگز قرآن وحدیث کے خلاف نہیں ہے۔

یہ بڑی ہی افسوسناک صورت حال ہے۔ عامۃ الناس میں یہ صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے کہ وہ عربی ادب کی ایک خاص حد تک تحصیل وتکمیل کریں، قرآن وحدیث کے وسیع ذخیرہ پر خوب گہری نظر رکھیں، اس ذخیرہ میں جہاں جہاں معنوی تحریفیں اور تاویلیں کی گئی ہیں ان کی تہ تک پہنچیں، اختلافات میں محاکمہ کر کے جانب راجح کو اختیار کریں، شرعی احکام کی حکمتوں اور باریکیوں کو سمجھیں اور حدود شرعیہ کے نکتوں کو پائیں۔ پھر اگلوں کی تاریخ پر بھی وسیع نظر ڈالیں اور ان کے تمام اقوال وافعال میں حق وناحق اور مناسب ونامناسب کو بھی ممیز کرتے چلے جائیں۔

یہ سب کچھ اہل علم کا کام ہے اور جب انہیں میں سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی نکلتی چلی جائے

جو ''بازمانہ باز'' کے نظریہ پر عامل ہوں اور دنیا پرستانہ اور مطلب جویانہ ذہنیت لے کر میدان میں اتر آئیں تو عوام کو امن کہاں ملے گا۔ ان کی گمراہیوں کا دائرہ پھیلے گا اور خوب پھیلے گا۔ اس کے سکڑنے اور کم ہونے کی آخر صورت کیا ہے!

ان مولویوں نے کتابوں اور رسالوں کا جو ڈھیر لگا دیا ہے اور اس میں کتاب وسنت کی کھلی کھلی معنوی تحریفات سے عوام کے مطلب کی جو جو باتیں چھانٹی ہیں وہ تو بے شمار ہیں، مگر ہم محض ناظرین کی سرسری واقفیت کے لیے اپنے موضوع کی حد تک چند باتوں کا ذکر کرتے ہیں تاکہ ایک ہی چاول سے اندازہ کیا جاسکے کہ پوری دیگ میں کیا ہے؟

موجودہ زمانہ میں ایک صاحب نے قرآن کی تفسیر لکھی ہے۔ جب انہوں نے قرآن کھولا تو اس کی ابتدائی آیات ہی میں ﴿إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ انہیں یہاں یہ مشکل پیش آئی کہ یہ لفظ تو اس پورے معتقدات کی جڑ ہی پر ایک کاری ضرب لگا رہا ہے جو عامۃ الناس میں شائع وذائع ہیں اور جن کی بنیاد پر انہوں نے مشرکانہ اعمال ورسوم کی ایک نئی شریعت ایجاد کر رکھی ہے۔ چنانچہ مفسر صاحب نے اس کانٹے کو راہ سے نکالنے یا کم از کم اسے بے ضرر بنا دینے کے لیے قرآن میں غور وخوض کرنا شروع کیا اور چند عقلی وتجربی دلائل کی کمک بھی ساتھ ساتھ لے آئے۔ پھر اس سے بھی کام نہ چلا تو مغالطے دینے اور جذباتی انداز میں گفتگو کر کے لوگوں کو عقلی ونقلی دلائل سے بے پرواہ کرنے کی کوشش کی۔

﴿إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ میں حصر موجود ہے اور عربی کا ہر مبتدی اس کا ترجمہ اردو زبان میں یہی کر سکتا ہے کہ ''اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔'' اگرچہ ''ہی'' کے حصر کو اڑا دینے کے بعد راستہ کچھ آسان ہو جاتا ہے، مگر ترجمہ کی تحریف کے باوجود متن تو جوں کا توں رہتا ہے اور اس میں تحریف ممکن نہیں، اس لیے مفسر صاحب نے تفسیر کا ایک اور راستہ اختیار کیا اور وہ یہ ہے کہ ''اہل اللہ سے مدد مانگنا دراصل اللہ ہی سے مدد مانگنا ہے۔ اہل اللہ غیر اللہ نہیں ہوتے، فنا فی اللہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنی حاجات میں ان سے مدد مانگنا ﴿إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کے خلاف نہیں ہے۔'' اس کے بعد وہ آگے بڑھے اور فرمایا کہ دیکھو! قرآن میں ﴿فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ﴾ (یعنی قوت سے میری مدد کرو) آیا ہے۔ یہ ذوالقرنین کا قول ہے۔ جب اس جیسے زبردست اور طاقتور بادشاہ کو بھی دوسروں کی مدد ضروری ہوئی تو ہم جیسے کمزوروں کو اللہ والوں کی مدد کیوں ضروری نہیں!

اس کے بعد وہ ''عقلی وتجربی دلائل'' پر آئے اور کہا کہ کوئی شخص اگر جنگل میں بھٹک جائے تو کیا وہ

لوگوں کو نہیں پکارے گا کہ "بھائیو! میری مدد کرو"۔ بس اسی طرح ہم بھی بھٹکے ہوئے ہیں، اس لیے پکارتے ہیں کہ "یا غوث! یا خواجہ! ہماری کیجئے"۔

جب ان "قیمتی دلائل" پر بھی دل مطمئن نہ ہوا تو مغالطہ دینے کی سوجھی اور ارشاد فرمایا کہ "تم جس طرح پانی لانے کے لیے ملازم کو پکارتے ہو اور ملازم کی یہ مدد جائز ہے تو "اولیاء اللہ" کو پکارنا اور ان سے مدد مانگنا کیوں ناجائز ہوا" یہ سب کچھ کہہ جانے کے باوجود مفسر صاحب کی تسلی نہیں۔ وہ خوب جانتے تھے کہ عوام کو نقلی و عقلی باتوں سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف جذباتی باتوں سے متاثر ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ جو لوگ "اولیاء اللہ" کو نہیں مانتے وہ ایسے اور ایسے ہیں۔ اولیاء کا درجہ اتنا اتنا بلند ہے اور اللہ تعالیٰ تک براہ راست رسائی تم جیسے کمینوں کا کام نہیں ہے، اس لیے ان کے واسطے سے پہنچو اور ان تک پہنچ جانا اللہ تعالیٰ تک ہی تک پہنچ جانا ہے...... وغیرہ!

حالانکہ ان تمام باتوں میں ایک بات بھی صحیح نہیں۔ جہاں تک اسباب طبعی کا تعلق ہے، ان سے کام لینا اور اس کام کے دوران میں ایک دوسرے کی مدد کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے اور اسی پر سانس لینے اور زندہ رہنے کا دارومدار ہے! لیکن مافوق الطبعی اسباب کو پیدا کرنا اور ان سے کام لینا بالکل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اور اس کے لیے اسی سے مدد مانگنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص پیاس کی حالت میں اپنے خادم کو پانی لانے کے لیے پکارتا ہے تو وہ اسی لیے پکارتا ہے کہ خادم اس کی آواز سننے اور پکارنے والے کو یقین ہے کہ اس کا خادم پانی لانے پر قادر ہے۔ لہٰذا اس کا پکارنا اور یقین کرنا بالکل درست ہے کیونکہ یہ سب سلسلہ اسباب کے تحت ہے جس پر سارا نظام عالم قائم ہے، لیکن اگر وہ پانی کے لیے کسی "ولی" کو پکارے جو اس سے سینکڑوں ہزاروں میل دور کسی قبر میں دفن ہے تو اس کا معنی یہ ہوا کہ وہ ان "ولی صاحب" کو سمیع و علیم سمجھتا ہے اور اس کا اعتقاد یہ ہے کہ عالم اسباب پر ان کی فرماں روائی قائم ہے، جس کی وجہ سے وہ مافوق الطبعی طور پر سلسلہ اسباب کو پیدا کرنے اور اسے حرکت دینے پر قادر ہیں۔ یہی شرک فی الصفات ہے، جو کسی طرح جائز نہیں!

اور ایک پانی ہی کیا! زمین و آسمان اور ان کی درمیانی اشیاء میں سے کوئی شئے ایسی نہیں جس کے طبعی و مافوق الطبعی اسباب کا سررشتہ براہ راست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں نہ ہو، مگر طبعی اسباب سے کام لینے اور اس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی اللہ تعالیٰ نے خود اجازت دی ہے اور اسی کا نام زندگی یا حیات ہے۔ اس لیے وہ تو بالکل جائز ہے، مگر اس سے ہٹ کر مافوق الطبعی طور پر اللہ تعالیٰ کے سوا یا اس کے

ساتھ کسی جاندار یا بے جان چیز کو متصرف فی الخلق سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا بالکل ناجائز ہے۔

﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ میں حصر اسی دوسری چیز کے لیے ہے نہ کہ پہلی چیز کے لیے۔ یہی پہلی چیز ہے جس کو عمل میں لانے کا ہر انسان محتاج ہے، چاہے وہ اپنی ذات میں کتنا ہی طاقتور اور اپنی صفات میں کتنا ہی برگزیدہ ہو۔

یہی چیز تھی جس کے لیے ذوالقرنین نے ﴿فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ﴾ کہا تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد کے زندہ لوگوں سے اپنے زیرِ تعمیر بند کے استحکام کے لیے جسمانی محنت و مشقت کی مدد مانگی تھی۔ اس نے یہ نہیں کیا تھا کہ بند کی ضرورت محسوس ہوئی تو گزرے ہوئے زمانہ کے لوگوں کو قبروں سے بلانا شروع کر دیا، یا ان کو اس لیے پکارنے لگا کہ وہ مافوق الطبعی اسباب کو حرکت دے کر ایک کرشمہ یا کرامت کے ذریعہ سے اس کے لیے ایک عظیم الشان بند بنا کر دے دیں۔

رہ گیا عبد و معبود کا تعلق! تو عبد خواہ کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ جائے اور اس سے معبود کا اور معبود سے اس کا تعلق کتنا ہی گہرا اور مضبوط ہو وہ عبد ہی رہتا ہے، اس کے اندر معبودیت یا الوہیت کا کوئی شائبہ تک نہیں آنے پاتا۔ اس عقیدہ پر خود وہ کلمہ شہادت ہی دلالت کرتا ہے جسے ادا کر کے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے الٰہ ہونے کی قطعی نفی کی گئی ہے۔ آپ لفظ الٰہ کے لغوی معانی کی تحقیق کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی اور نفع و نقصان پہنچانے کے تمام مافوق الطبعی تصورات موجود ہیں۔ پھر نبی ﷺ پر جس حیثیت سے ایمان لانا اور اس کی بار بار گواہی دیتے رہنا فرض ہے وہ یہی ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول تو ہیں لیکن آپ ﷺ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتہائی برگزیدگی کا تعلق رکھنے کے باوجود آپ ﷺ میں الوہیت کی ایک صفت بھی نہیں پائی جاتی!

اب فرمائیے کہ کلمہ کی رو سے ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہیے اس کے برخلاف عقائد رکھتے ہوئے کلمہ پڑھتے رہنا آخر کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اگر آپ بھٹکے ہوئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ روشن کر کے رکھ دیا ہے، اس پر چلیے۔ اسے چھوڑ کر اور اس کے بندوں کو پکار کر تو آپ اور زیادہ بھٹکے جا رہے ہیں!

لطف یہ ہے کہ مفسر مذکور نے ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کی تفسیر میں محض استعانت لغیر اللہ ہی کا ذکر نہیں

کیا، بلکہ لگے ہاتھوں ''فاتحہ'' وغیرہ قسم کی بہت سی چیزوں کا بھی اسی شان کے ساتھ ذکر فرما دیا۔ اب اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں قرآن کی بسم اللہ ہی ایسی ایسی ''نکتہ آفرینیوں'' سے کی گئی ہو، وہاں پورے قرآن کی تفسیر کا کیا رنگ ہوگا!

ایک اور مثال لیجیے:

عامۃ الناس میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ''اولیاء اللہ'' مرنے کے بعد بڑی زبردست قوت کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ ساری دنیا کی باتوں کو جانتے، ساری آوازوں اور دعاؤں کو سنتے، تمام حرکات وسکنات کو دیکھتے، ان کے حضور پیش کی جانے والی تمام درخواستوں کو پڑھتے اور ہر کارروائی کا فیصلہ فرماتے ہیں۔ وہ نذر دینے والوں سے خوش اور منت پوری نہ کرنے والوں سے ناخوش ہوتے ہیں اور دفع مضرات و دفع بلیات اور عطاء و بخشش کے بڑے وسیع اختیارات رکھتے ہیں۔ اس خیال کی تائید وتصویب کے لیے جب قرآن پر نظر ڈالی گئی تو وہ اس آیت پر جا کر ٹھہری:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ﴾

(البقرہ۲۰ آیت ۱۵۴)

''جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان (کی زندگی) کا شعور نہیں۔''

بس کہہ دیا گیا کہ دیکھو! یہ حیات بعد مردن کا کتنا کھلا اثبات ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے ان بزرگوں کو احیاء (زندہ لوگ) فرمایا ہے، اور وہ بھی اتنی تاکید کے ساتھ کہ ''انہیں مردہ نہ کہو۔'' پس معلوم ہوا کہ زندہ نہ سمجھنا تو ایک طرف انہیں زبان سے مردہ تک کہنا جائز نہیں۔ جو شخص ''مردہ'' کا لفظ زبان سے نکالتا ہے وہ سخت گستاخ اور بے دین ہے۔ پھر یہ حیات، انتقال مکانی کے بعد کی ہے۔ اس لیے وہ حیات دنیوی کے مقابلہ میں اتنی اعلیٰ واشرف ہے کہ اس دنیا کا کوئی شخص اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اسی لیے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لَا تَشْعُرُوْنَ (تم سمجھ نہیں سکتے)۔ رہ گئی یہ بات کہ اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو فی سبیل اللہ قتل کیے جائیں، تمام ''اولیاء و بزرگان دین'' کا عموم اس سے نہیں نکلتا! تو اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا گیا کہ کافر کے ہاتھ سے قتل ہونے والا انسان جب یہ مرتبہ حاصل کرتا ہے تو بھلا ''عشق الٰہی'' کی تلوار سے قتل ہونے والا یہ مرتبہ کیوں نہیں حاصل کر سکتا۔ بلکہ غور کیجیے تو اس قسم کے لوگ ہی عام شہداء سے بہت بلند و بالا ہیں۔

اگر چہ آیت کی یہ تفسیر ہی عامۃ الناس کے عقیدہ کو خوب مضبوط کر دیتی ہے، مگر پھر بھی یہ کچھ ڈھیلی ڈھالی اور ناکافی سی ہے۔ کیونکہ بزرگان دین کی حیات برزخ سے جس جس طرح الوہیت کی صفات کو وابستہ کیا گیا ہے، اس کے لیے مزید تائید کی ضرورت ہے۔ اس لیے یہ کسر بھی پوری کر دی گئی۔ کہا گیا کہ "بزرگان دین" طرح طرح کے سخت مجاہدوں سے اپنی روح کو دنیا میں اتنا طاقتور بنا لیتے ہیں کہ انتقال مکانی کے بعد ان کی روح بلندی میں پرواز کرتے وقت امر رب ہی بن جاتی ہے۔ پھر وہ جو کچھ کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ......الخ﴾ (بنی اسرائیل ۱۷: آیت ۸۵)

"لوگ آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ روح تو امر رب ہے!"

نیز آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے چند مقام پر اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں:

﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ......الخ﴾ (الحجر ۱۵: آیت ۲۹/ص ۳۸: آیت ۷۲)

"جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں!"

حالانکہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے، اس میں سب سے اولین قابل توجہ بات یہ ہے کہ ﴿بَلْ اَحْيَآءٌ﴾ کی تفسیر میں شہداء و اولیاء کی حیات سے متعلق جتنی باتیں چاہے کہہ لیجیے! لیکن اس کو الوہیت کی صفات سے متصف نہ کیجیے۔ یہی تو شرک ہے، جس کی تردید سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ قرآن کی پوری دعوت ہی توحید الٰہ کی بنیاد پر ہے۔ اس لیے اس کی کسی آیت کی ایسی تفسیر ہرگز جائز نہیں جو اس کی پوری تعلیم اور اس کے سارے اصول و کلیات کے خلاف ہو، بلکہ اس قسم کی تفسیری کوششیں دراصل معنوی تحریفیں ہیں۔ رہ گئیں آیات قُلِ الرُّوْحُ اور فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ! تو جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے، اس میں لفظ "روح" ہی کے متعلق اہل تفسیر کا اختلاف ہے کہ اس سے مراد جان ہے یا کچھ اور؟

ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ، حسن بصری وغیرہ رحمہم اللہ نے روح کے معانی وحی یا وحی لانے والا فرشتہ بیان کیے ہیں۔ تاہم اس سے مراد جان ہی ہو تب بھی اس کے لیے ﴿مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، یعنی وہ میرے رب کے حکم سے ہے نہ کہ خود امر رب ہے۔ لفظ من کو نظر انداز کر دینے سے مفہوم کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ یہی حال دوسری آیت کا ہے۔ اس میں اول تو یہ نہیں فرمایا کہ "میں اپنی روح پھونک دوں" بلکہ یہ فرمایا ہے کہ "اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں۔" دوسرے اس کا مفہوم محض یہ ہے کہ انسانی روح صفات الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے اور اسی عکس یا پرتو کی وجہ سے انسان زمین پ

اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور عالم ارواح میں ملائک کا مسجود قرار پایا۔ اس سے یہ مطلب نکال بیٹھنا کہ صفات الٰہی میں سے ایک حصہ پانا الوہیت کا کوئی جزو پالینے کا ہم معنی ہے، اتنی بڑی غلط فہمی ہے کہ قرآن کی پوری تعلیم ہی پر خط نسخ پھیر دیتی ہے۔ قرآن نے اپنی تعلیم مبہم و مغلق بنا کر پیش نہیں کی۔ اگر کہیں اختصار سے کام لیا ہے تو دوسری جگہ توضیح و تفصیل بھی کر دی ہے، اور اس کی کوئی آیت ایسی نہیں جو اس کے پیش کردہ تصور اللہ پر غلط طریقے سے اثر انداز ہوتی ہو۔ یہ تو خود لوگوں کی اپنی ہی شرک پرستانہ ذہنیت اور اس ذہنیت کو تقویت دینے والی فتنہ جویانہ نیت ہے جس کے زیر اثر انہیں توحید کی تعلیم دینے والی کتاب میں شرک کے جراثیم کلبلاتے نظر آتے ہیں!

مزید ایک مثال دیکھیے:

عوام کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ دوسری تمام بخششوں کی طرح عطاء اولاد کے لیے بھی ''اولیاء اللہ'' نہ صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں بلکہ خود بھی اسے بخشنے پر قادر ہیں۔ چنانچہ اس کا اظہار ان کی زبانوں ہی سے نہیں بلکہ باقاعدہ ان کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے، جو وہ درخواستوں کی شکل میں ''مزارات اولیاء'' پر لٹکاتے ہیں۔ ان میں صاف صاف اہل قبور سے خطاب کیا جاتا ہے کہ ''ہمیں اولاد دیجیے۔'' اب کیسے ممکن تھا کہ جن مولویوں کا سارا مفاد ہی عوام کے عقائد و اعمال سے وابستہ ہے، وہ اسے بھی سند جواز نہ دیں۔ چنانچہ اس غرض کے لیے انہوں نے قرآن میں ٹوہ لگائی اور تلاش و تفحص کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اگر وہ طلب ہدایت کے لیے قرآن پڑھتے تو کسی بھی مقام کی دو چار آیتیں ہی ان کی ہدایت کے لیے کافی تھیں، مگر وہاں سرے سے طلب ہدایت ہی مقصود نہ تھی۔ وہاں تو مقصود صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح کہیں سے کوئی اشارہ ہی ایسا نکل آئے جس سے ان کے ''پیارے عوام'' کے عقائد کی ''صحت'' پر مہر تصدیق ثبت ہو سکے۔ چنانچہ وہ بیسیوں ایسی آیات پر سے گزرے جن میں نہایت صاف و صریح الفاظ کے ساتھ ان کے عقائد کا ابطال اور صحیح عقائد کا اثبات موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے پھیر پھیر کر حقائق واقعیہ کو بیان فرمایا ہے مگر ان کے پھرے ہوئے ذہن میں کوئی بات اتر نہ سکی۔ جب قرآن کے مجموعی مضامین و مطالب میں اپنے مفید مطلب بات کے پانے سے وہ مایوس ہو گئے تو پھر لفظ لفظ اور حرف حرف کو دیکھنا شروع کیا، تاکہ اگر کوئی رائی بھی کہیں مل سکے تو وہ اپنے نحوی اور صرفی علم کی مدد سے اسے پہاڑ بنا دیں۔

بالآخر ان کی نگاہ سورۂ مریم کے دوسرے رکوع میں آیت:

﴿قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَهَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا﴾[1]

---

[1] آیت ۱۹ ــــ (ترجمہ) ''اس نے کہا: ''میں تو تیرے رب کا رسول ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔''

پر جا کر ٹھہر گئی اور جب انہوں نے غور کیا تو لفظ لاَھَبَ پر پہنچ کر وہ خوشی کے مارے اچھل پڑے۔ انہوں نے کہا: ''دیکھو! یہ ہے دلیل اس بات کی کہ ''اولیاء اللہ'' کو عطاء اولاد پر پوری قدرت حاصل ہے۔ یہاں فرشتہ نے اولاد کی بخشش کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ لہٰذا انسانوں میں بھی نہایت بزرگ و برتر ہستیوں کے لیے بھلا یہ کیسے ناممکن ہے کہ وہ اولاد جیسی چیز نہ دے سکیں!''

حالانکہ اس معاملہ کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ فرشتہ نے ''بخشنے'' کا فعل محض مجازی طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ:

''میں آپ کے رب کا بھیجا ہوا ہوں''

آیت مذکورہ کا سیاق و سباق دیکھئے! اللہ تعالیٰ خود اس فرشتہ کے متعلق فرماتا ہے کہ ﴿...... فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا...... الخ[1]﴾ (مریم کے پاس فرشتہ کو ہم نے بھیجا) مریم علیہا السلام بے شوہر بچہ پیدا ہونے پر تعجب کا اظہار کرتی ہیں تو فرشتہ کہتا ہے:۔

﴿......قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ...... الخ﴾[2]

''آپ کا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے۔''

فرشتہ کا یہ قول اس کے زیر بحث قول کو قطعی طور پر مجاز کا رنگ دے رہا ہے۔ اگر یہ بات نہیں، تو کیا اللہ تعالیٰ نے کار تخلیق میں فرشتوں یا کسی اور مخلوق کو اپنا شریک بنا رکھا ہے؟

اللہ تعالیٰ کے ماننے والوں میں نہ کوئی انسان ایسا پایا گیا ہے اور نہ کبھی پایا جائے گا جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے خالق واحد ہونے اور کائنات کی ہر جاندار و بے جان چیز کے مخلوق ہونے کا انکار کرتا ہو۔ جب انسان اور فرشتے اس کی مخلوق ہیں تو مخلوق ہی کو کار تخلیق میں شریک کر دینے کا کیا مطلب ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ جل شانہ خود فرماتا ہے:

﴿......وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا...... الخ﴾ (مریم۱۹: آیت ۲۱)

''ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی اور اپنی طرف سے ایک رحمت بنا دیں۔''

یہی واقعہ سورۂ آل عمران کے پانچویں رکوع میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ایک فرشتہ نہیں بلکہ فرشتوں کی ایک جماعت مریم علیہا السلام کے پاس آئی تھی اور اس لیے آئی تھی کہ

---

[1] مریم۱۹: آیت ۱۷ [2] ایضاً: آیت ۲۱

مریم علیہا السلام کو لڑکے کی بشارت دے۔ سرگروہ کی حیثیت سے جب ایک فرشتہ مریم علیہا السلام سے مخاطب ہوا تو کہا کہ:

﴿...... كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾

(آل عمران ۳: آیت ۴۷)

''ایسا ہی ہوگا۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔''

کیا یہ کن فیکون کی شان بھی اللہ کے سوا کسی اور کے لیے مختص ہے؟ کیا اس میں بھی اس نے فرشتوں اور انسانوں کو شریک ٹھہرالیا ہے؟ اگر بات یہ نہیں تو ماننا چاہیے کہ فرشتہ لڑکا دینے کے لیے نہیں بلکہ صرف بشارت دینے کے لیے آیا تھا۔ مگر جب وہ انسانی شکل میں متمثل ہو کر مریم علیہا السلام کے سامنے آ گیا تو اس نے بشارت کی تقویت کے لیے لڑکا بخشنے کا فعل مجازی طور پر اپنی طرف منسوب کر لیا۔ پورا قرآن تو خیر خود اس لفظ **لاھب** کا سیاق وسباق ہی اس ذرا سے مجاز کو حقیقت کی طرف لے جانے کے سارے راستے بند کر دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں سورۃ الاعراف کے آخری رکوع کی ابتدائی آیات کا مطالعہ نہایت بصیرت افروز ہو گا۔ فرمایا ہے:

﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝﴾ (الاعراف ۷: آیت ۱۸۹، ۱۹۰)

''وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لیے لیے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اپنے رب اللہ سے دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح وسالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی اس بخشش وعنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ تعالیٰ بہت بلند وبرتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں!''

ان آیات پر ''تفہیم القرآن'' میں سید مودودی رحمہ اللہ نے جو حاشیہ لکھا ہے اس کا حسب ذیل پیراگراف بار بار پڑھنے اور عبرت حاصل کرنے کے لائق ہے۔فرماتے ہیں:

''ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی مذمت کی ہے وہ عرب کے مشرکین تھے اور ان کا قصور یہ تھا کہ وہ صحیح وسالم اولاد پیدا ہونے کے لیے تو اللہ تعالیٰ ہی سے دعا مانگتے تھے مگر جب بچہ پیدا ہو جاتا تھا تو اللہ کے اس عطیہ میں دوسروں کو شکریہ کا حصہ دار ٹھہرا لیتے تھے۔بلاشبہ یہ حالت بھی نہایت بری تھی لیکن اب جو شرک ہم توحید کے مدعیوں میں پا رہے ہیں وہ اس سے بھی بدتر ہے۔یہ ظالم تو اولاد بھی غیروں ہی سے مانگتے ہیں۔حمل کے زمانہ میں منتیں بھی غیروں کے نام ہی کی مانتے ہیں اور بچہ پیدا ہونے کے بعد ''نیاز'' بھی انہی کے آستانوں پر چڑھاتے ہیں۔اس پر بھی زمانہ جاہلیت کے عرب مشرک تھے اور یہ موحد ہیں۔ان کے لیے جہنم واجب تھی اور ان کے لیے نجات کی گارنٹی ہے۔ان کی گمراہیوں پر تنقید کی زبانیں تیز ہیں مگر ان کی گمراہیوں پر کوئی تنقید کر بیٹھے تو مذہبی درباروں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

اسی حالت کو حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں یوں بیان کیا ہے:۔

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
''مزاروں'' پہ جاجا کے نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے!''

یہ نمونہ تو تھا قرآن کی ''تفسیر'' کا۔لیکن یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ہاں قبروں اور قبر والوں کے تعلق

سے جو رسمیں رائج ہیں، ان کے کوئی اصطلاحی نام تو قرآن وحدیث میں نہیں ملتے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ان کے ایسے نام تجویز کر دیئے جائیں جو فی نفسہٖ قابل اعتراض بھی نہ ہوں اور شرک جلی کی تعریف میں بھی نہ آسکیں۔ چنانچہ مولویوں نے یہ فنی خدمت بھی خوب انجام دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

آپ ان تمام کھانوں سے واقف ہی ہوں گے جو خاص خاص تاریخوں میں، بڑے اہتمام واحترام کے ساتھ، مخصوص آداب وقواعد کے تحت مسلمانوں کے ہاں پکائے جاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک باقاعدہ نظام فکر وعمل ہے۔ اس کے الگ الگ اجزاء کو لیجئے تو خواہ مخواہ ان کے تعین وعدم تعین اور جواز وعدم جواز کی بحث پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس مجموعہ کا ایک مختصر اور مفید نام ''فاتحہ'' رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ کوئی برا اور بے معنٰی لفظ نہیں، ایک اچھا اور بامعنٰی لفظ ہے اور قرآن کی ایک سورۃ کا نام بھی ہے اور سورۃ بھی وہ جسے خود قرآن نے سبع من المثانی کہا ہے، یعنی سات ایسی آیات جو بار بار دوہرائی جانے کے لائق ہیں۔ اس کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

((لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب!))

(صحیح بخاری صفۃ الصلوٰۃ، حدیث ۷۵۶/ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، ۸ روایات)

یعنی سورۃ الفاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ بھلا اس پر اعتراض کی گنجائش ہی کیا ہے۔ لیکن آپ کو صاف محسوس ہوگا کہ لفظ ''فاتحہ'' کے معنٰی اور خود سورۃ الفاتحہ سے عقیدہ وعمل کے اس پورے نظام کا کوئی دور و قریب کا تعلق نہیں، جو مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ اب آپ اگر ''فاتحہ'' کے قائلین سے یہ فرمائیں کہ تم جو نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہو یا غیر از نماز کہیں بیٹھے بیٹھے پڑھ لیتے ہو، اسی کو کافی سمجھو اور اس کے سوا ''فاتحہ'' کے نام سے کچھ نہ کرو! تو ان میں سے کوئی شخص اس کے لیے آمادہ نہ ہوگا۔ مگر اس کے باوجود ''فاتحہ'' کے نام سے جو کچھ کیا جاتا ہے، اس کو یہ ایک لفظ اعتراض کی زد سے نکال لیتا ہے۔

رہ گئی ''فاتحہ'' کی غرض! تو اس کے لیے بھی کوئی ایسا ہی بامعنٰی بلکہ شرعی تصورات سے قریب تر کوئی لفظ چاہیے تاکہ مقصد کی پاکیزگی ثابت ہو جانے کے بعد عمل کی پاکیزگی خود بخود ثابت ہو جائے۔ چنانچہ فاتحہ کی غرض کو ''ایصال ثواب'' کا نام دیا گیا۔ جس کا معنٰی ہے ''ثواب پہنچانا''۔ جہاں تک مُردوں کو ثواب پہنچانے کا تعلق ہے، اس کی تو بعض شکلیں خود حدیث نبوی ﷺ میں موجود ہیں اور ائمہ سلف بھی

قائل ہیں کہ بدنی اور مالی عبادات کا ثواب پہنچ سکتا ہے۔ پس عقیدہ و عمل کی بہت سی خرابیاں اس لفظ کے پیچھے جا چھپیں مگر اس سلسلہ میں جو بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کو چھوڑ کر صرف دو باتیں قابل توجہ ہیں:

[اسلام کا نظریہ ایصال ثواب جو قرآن وحدیث سے مترشح ہے یہ ہے کہ مُردوں کے لیے ایصال ثواب کی شکلیں یہ ہیں:۔

✪ ان کے لیے دعائے مغفرت کردی جائے۔ یہ امر پیش نظر رہے کہ دعائے مغفرت کا ذکر ہو رہا ہے، ''فاتحہ'' کی بدعت کا نہیں۔ دوسرا یہ کہ دعائے مغفرت کہیں بھی کی جاسکتی ہے، مثلاً نماز کے بعد، تلاوت قرآن کے بعد! مسجد، گھر، دفتر وغیرہ میں! چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے بھی! دوران سفر میں بھی! بہتر یہ ہے کہ باوضو ہو کر دعا مانگی جائے لیکن یہ ضروری نہیں۔ اگر قبرستان میں جا کر دعائے مغفرت کرنی ہو تو پھر قبر پر جا کر، ''مزار'' پر نہیں! کیونکہ یہ ''مزار سازی'' ہی اسلام میں سخت ممنوع ہے چہ جائیکہ وہاں جا کر دعا مانگی جائے۔

✪ اگر فوت شدہ شخص صحیح العقیدہ عالم دین تھا اور وہ اپنے پیچھے شاگرد چھوڑ گیا ہے تو اس کے وہ شاگرد جب تک دین کی تعلیم کو عام کرتے رہیں گے اور دین پر عمل کرتے رہیں گے، ان کے ساتھ ساتھ ان کے فوت شدہ استاد کو بھی ثواب ملتا رہے گا۔

✪ حدیث کے مطابق نیک اولاد بھی صدقہ جاریہ ہے۔ اس لیے نیک اولاد (جو یقیناً صحیح العقیدہ ہوگی) کے تمام نیک اعمال کا ثواب ان کے فوت شدہ والدین کو بھی ملتا رہے گا۔

✪ اگر فوت شدہ شخص اپنی زندگی میں رفاہ عامہ / ترویج دین کا کوئی عملی کام کر گیا ہے، مثلاً مسجد کی تعمیر، کنواں وغیرہ کی تعمیر، دینی مدرسہ کا قیام، مستحقین کی ایسی مالی مدد جس سے وہ اپنا روزگار کا کوئی سلسلہ قائم کرلیں، راستوں پر درخت لگوانا...... وغیرہ! تو یہ کام اس کے لیے تب تک صدقہ جاریہ بنے رہیں گے یعنی اسے ثواب ملتا رہے گا جب تک یہ قائم رہیں گے!---ادارہ]

۱) ایک تو یہ کہ قرآن اور احادیث نبوی ﷺ میں ایصال ثواب کی بہترین صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ آدمی اپنے ساتھ اپنے اسلاف کو بھی دعوات خیر میں شریک رکھے۔ دعاء خیر سے زیادہ بہتر تحفہ اور کوئی نہیں۔ اور اگر نبی ﷺ نے ایصال ثواب کے لیے بدنی یا مالی عبادت کی اجازت دی بھی ہے تو وہ بھی کبھی کبھار۔ یہ کہیں نہیں پایا جاتا کہ آدمی اسے معمول ہی بنالے اور فرائض تک سے بے پرواہ ہو کر اس کام میں اپنی قوت اور دولت کا ایک بڑا حصہ خرچ کردے۔ پھر یہ ''ایصال ثواب'' کے نام سے کیے جانے والے لمبے چوڑے کاموں کی اصل علت کیا ہے؟

۲) دوسری بات یہ ہے کہ ایصال ثواب کے اصل مستحق ہمارے وہ اعزاء و اقرباء یا دوست احباب ہیں جن کی وفات ہمارے سامنے ہوئی ہے اور جن کے حالات سے ہم واقف رہے ہیں، یا پھر وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کم از کم ہمارا گمان یہ ہو کہ وہ ثواب کے محتاج یا مستحق ہیں۔ مگر جن بزرگوں نے خود اپنی نیکی اور پرہیزگاری سے اپنے لیے ثواب کا بہت کچھ سرمایہ اکٹھا کرلیا ہو تو انہیں ''ثواب'' پہنچانے کا کیا

مطلب ہے؟ آخر کوئی یہ بھی تو سوچے کہ ثواب کس قسم کے لوگوں کی طرف سے کس قسم کے لوگوں کو پہنچایا جا رہا ہے؟ کیا آپ کے خزانہ میں ثواب اتنی بڑی مقدار میں جمع ہے کہ آپ کو اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے اور آپ مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنا زائد از ضرورت ثواب دوسروں کو پہنچا دیا جائے؟

[کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا (اور نہ ہی یہ سوچنا چاہیے) کہ میرے نامہ اعمال میں بہت زیادہ ثواب جمع ہو گیا ہے، اس لیے اب میں دوسروں کو ایصال ثواب کر دوں۔ ایسا سمجھنے اور کہنے سے غرور نفس اور تکبر کا اظہار بھی ہو گا اور خود نمائی اور ریاء کا بھی سخت خطرہ موجود ہے جسے حدیث میں شرک کہا گیا ہے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کسی شخص نے کس قدر ثواب کمایا ہے؟ اصولاً ہر مسلمان کو زیادہ سے زیادہ نیک اعمال اور ثواب کی ضرورت ہے۔ قرآن وحدیث میں اسی کی بار بار تاکید وترغیب کی گئی ہے---ادارہ]

یہی حال قبر پرستی اور اس کے سارے لوازم ومقتضیات کا بھی ہے۔ انہوں نے ''قبر پرستی'' کو ''زیارت قبر'' کا شرعی نام دیا ہے، حالانکہ وہ ''زیارت قبر'' نہیں ''عبادت قبر'' ہے۔ قبروں پر حاضری دینے کی اصل غرض کو ''توسل'' اور ''اکتساب فیض'' وغیرہ جیسے الفاظ کے خوشنما پردوں میں چھپایا گیا ہے۔ حالانکہ کسی ''ولی'' کی قبر پر حاضری دے کر یہ سمجھنا کہ چھوٹے صاحب تک رسائی ہو چکی ہے، اب وہ ہمیں بڑے صاحب کے ہاں پہنچانے، ان کے ہاں ہماری سفارش کرنے اور ہمیں ان کا مقرب بنانے کا اختیار رکھتے ہیں یا اس قبر کو فیض کا ایک بحر ذخار سمجھ بیٹھنا جہاں سے ہر حاجت مند کو اپنی ہر چھوٹی بڑی مادی وروحانی ضرورتیں پوری کرنے کا سامان مل جایا کرتا ہے، بے ریب وشک ایک مشرکانہ عقیدہ ہے۔ نام کی تبدیلی سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی اور نہ حقیقت کی تبدیلی کو نام کی تبدیلی کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ توسل کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے نیک لوگوں کو وسیلہ بناتے ہوئے دعا کی جائے۔ جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی دعا میں کہا تھا کہ ''اے اللہ! ہم اپنے نبی ﷺ کے چچا سے تیرے دربار میں توسل کرتے ہیں یا ہم اپنے نبی کے چچا کو تیرے پاس وسیلہ بناتے ہیں۔''

(صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء، حدیث ۱۰۱۰)

مگر اس کا التزام کر لینا صحیح نہیں کیونکہ اس کے معانی یہ ہیں کہ یا تو اللہ تعالیٰ وسیلہ کے بغیر کسی دعا کو قبول ہی نہیں کرتا، یا اس پر مخلوق کا کوئی حق ہے کہ جس کا واسطہ بار بار دلایا جا رہا ہے! اور یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

[''ولی'' کے بارے میں وضاحت کے لیے دیکھیے ''سنت وبدعت کی کشمکش'' شائع کردہ دارالمسلم لاہور---س۔ا۔ر]

[نیک لوگ بھی وہ جو زندہ ہوں، مُردوں سے نہیں! اور اس سلسلہ میں دعا کروانے والوں اور دعا کرنے والے یعنی جانبین کے عقاید کا صحیح ہونا ضروری ہے---ادارہ]

[قرآن پاک میں جتنی دعائیں ملتی ہیں ان میں ''توسل'' کہیں نہیں آیا۔ رسول اللہ ﷺ سے جو ماثورہ دعائیں امت تک پہنچی ہیں ان میں بھی براہ راست اللہ تعالیٰ ہی سے دعا اور التجا کی گئی ہے، کسی کا توسل اس میں نہیں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اپنی دعاؤں میں ''توسل'' کا التزام نہیں کرتے تھے۔ ان درجنوں قرآنی دعاؤں اور سینکڑوں احادیث و آثار سے ثابت شدہ دعاؤں کے مقابلہ میں ایک دو ''حدیث و آثار'' میں ''توسل'' بھی اگر ملتا ہے تو ایک محتاط مسلمان کا رجحان ''شذوذ'' کے مقابلہ میں ''کثرت'' کی طرف ہی ہوگا اور ہونا چاہیے۔ ''الوسیلہ'' کے موضوع پر محترمہ عطیہ خلیل عرب کا مقالہ اسی ''توحید نمبر'' [1] میں ضرور پڑھ لینا چاہیے!---ق۔م]

رہا اکتساب فیض کا معاملہ! تو اس کی حقیقت ان تصورات سے خود بخود نکھر کر سامنے آجاتی ہے جو شریعت نے اپنے پیروؤں کو دیئے ہیں۔ ہر مسلمان کو سلف صالحین کے حالات وخیالات اور ان کی باقیات سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے مطابق خود اتباع شریعت اور ارتقاء روحانیت میں سرگرم رہنا چاہیے۔ اس حال میں اگر وہ کسی مرد صالح کی قبر پر جائے تو اسے یقیناً روحانی بالیدگی اور قلبی نورانیت حاصل ہوگی اور یہی آخری حد ہے جہاں تک ایک مسلمان حدود شریعت میں رہ کر جاسکتا ہے!

اگر یہی چیز ''اکتساب فیض'' ہے تو اس کے جائز ہونے میں کلام نہیں ہوسکتا۔ مگر جانور، غلے اور دوسری اشیاء کے ساتھ جن سنتوں، مرادوں اور قربانیوں وغیرہ کا ہنگامہ ''قبروں'' پر جاری ہے، اس پر تو ''اکتساب فیض'' کا اطلاق نہ لفظی حیثیت سے ہوسکتا ہے نہ معنوی اعتبار سے۔ تاہم اس خاص فعل کے لیے بھی مولویوں نے چند اصطلاحات عوام کو دے رکھی ہیں۔ ''بھینٹ'' کا لفظ چونکہ ایک ہندی لفظ ہے اور مندروں اور استھانوں کے لیے مخصوص ہے، اس لیے آپ کسی مسلمان کی زبان سے یہ لفظ نہ سن سکیں گے، البتہ اسی چیز کے لیے جو الفاظ انہیں علماء کے دربار سے مل گئے ہیں وہ ہیں نذر، نیاز وغیرہ۔

دیکھیے! کس قدر بے ضرر اور معصوم الفاظ ہیں۔ اگرچہ لغوی و معنوی اعتبار سے ان کا استعمال غیر اللہ کے لیے بہت کچھ محل نظر ہے مگر نذر تو نذرانہ اور تحفہ کے معنی میں ہی مستعمل ہے اور نیاز کے لفظ کو بھی لوگ ایک دوسرے کے لیے بے تکلفانہ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے اس میں کراہت، نفرت اور حرمت کی وہ شدت نہیں جو بھینٹ، چڑھاوا اور نذر لغیر اللہ وغیرہ الفاظ میں پائی جاتی ہے!

مگر یہ تو محض ایک فعل ہے، ایسے کتنے ہی مختلف افعال کا ارتکاب سال بہ سال ''قبروں'' پر ہوتا رہتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس پورے بکھیڑے میں دولت، قوت اور محنت کا صرف کہاں تک جا پہنچتا ہے

---

[1] یہ مضمون ماہر القادری مرحوم کے جریدہ ''فاران'' کے ''توحید نمبر'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ (ادارہ)

اور گانے بجانے اور ناچ رنگ تک کی رنگینیاں اس میں کس طرح جلوہ دکھاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے ''ہنگامہ'' کا، جو کہیں کہیں اور کبھی کبھی نہیں ہوتا بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت اس کا منظر دیکھا جا سکتا ہے، کوئی ایسا مختصر اور جامع نام ہونا چاہیے جس کے پس پردہ احکام شریعت کی دل کھول کر توہین وتذلیل کی جا سکے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ نام کیا ہے؟ یاترا جاترا نہیں بلکہ ''عرس''۔ کیونکہ ''جاترا'' اس وقت تک کہتے تھے جب تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اب اس کی جگہ ''عرس'' کرتے ہیں۔ یہ لفظ اپنی معنویت کے اعتبار سے فی الواقع لائق داد ہے۔ ''عرس'' عربی میں شادی بیاہ کو کہتے ہیں اور شادی بیاہ لازماً ایک خوشی کا کام ہے لہٰذا خوشی اور جشن کے موقع پر جو جو کچھ انسان کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے وہ سب قبروں کے ''عرس'' میں از خود حلال ہو گیا بلکہ اسے کھینچ تان کر حلال کر لیا گیا۔ رہ گیا یہ شبہ کہ ''بزرگوں'' کے ایام وفات کو شادی کا دن کسی معنیٰ میں قرار دیا گیا ہے؟ تو ہمارے بعض مخصوص علماء کرام کی باریک بین اور نکتہ چیں نگاہوں نے اسے بھی دور کر دیا۔ جب ان کے سامنے وہ حدیث آئی جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر میت صالح ہوتی ہے تو فرشتے سوال وجواب کے بعد اس سے کہتے ہیں: نم کنومة العروس (سو جا، جس طرح دلہن سوتی ہے) بس انہوں نے فرما دیا کہ لو دیکھو! یہی ہے ''عرس'' چونکہ اولیاء اللہ اس دن عروس کی طرح سو جاتے ہیں، اس لیے اس دن یا اس سے آگے پیچھے جو کچھ ان کی قبروں پر ہوتا ہے، وہ ''عرس'' ہے!

[ان ''علماء'' کے ایسے مبلغ علم کو پڑھ سن کر کلمہ افسوس ہی کہا جا سکتا ہے---ادارہ]

اس تحقیق انیق پر بہت سی باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے مگر اس سے کلام بہت طویل ہو جائے گا۔ اس لیے ہم اشارۃً دو ہی باتیں عرض کیے دیتے ہیں:

ایک یہ کہ صالحین کو دلہن کی سی میٹھی، پیاری اور گہری نیند محض اس لیے نصیب ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو عمل صالح سے دلہن کی طرح آراستہ کیا تھا۔ آخر ان کی خوشی میں آپ کے شریک ہونے کا کیا موقع ہے؟ آپ بھی جایئے اور ویسی ہی زندگی اختیار کرنے کی کوشش کیجیے۔ قبروں پر ہنگامے بپا کرنے اور میلے لگانے سے تو صالحیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر صالحین اپنے یوم وفات ہی میں گہری نیند سو گئے ہیں تو ان سے اپنی حاجات طلب کرنے اور انہیں اپنا معبود بنانے کا کیا موقع باقی رہا؟ کیا معبود بھی سو جایا کرتے ہیں؟ اگر معبود سو جائیں اور دلہن کی سی نیند سو جائیں تو وہ اپنے عابدوں اور نیاز مندوں کا کیا بنا سکیں گے؟ اور اگر

ان کی نیند بیداری ہی کے مترادف ہے تو پھر سونے کا کیا مطلب ہے؟

مگر کسی مسلمان کی زبان پر اللہ کے سوا کسی ہستی کے لیے معبود اور الٰہ وغیرہ کے الفاظ نہیں آ سکتے۔ اس لیے ان صالحین امت کے ساتھ وہ سب کچھ معاملات رکھنے کے باوجود جو صرف اللہ ہی کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں، انہیں معبود اور الٰہ نہیں کہا جاتا۔ معبود بھی ہو اور معبود نہ کہلائے، الٰہ بھی ہو اور الٰہ نہ ٹھہرے! یہ ایسا مشکل مسئلہ ہے جسے کوئی بے علم اور نادان شخص حل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ آپ خود اس کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ آپ کسی شخص سے یہ کہہ دیجئے کہ تو اولیاء اللہ کو اپنا معبود سمجھتا ہے یا انہیں اپنا الٰہ بنا رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک جاہل کندۂ ناتراش، دیہاتی ان پڑھ آدمی بھی اس کا انکار کر دے گا اور آپ کا منہ نوچنے اور آپ کو پتھر مارنے کے لیے دوڑے گا۔ اس لیے حسب دستور مولویوں ہی نے اس مشکل کو حل کر دیا اور وہ یہ ہے کہ اولیاء وصالحین کو معبود بنانا کیا ضرور، ان کے ساتھ معاملہ تو وہی رکھو جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ مگر انہیں ''غوث، قطب، دستگیر، گنج بخش، بندہ نواز، مشکل کشا۔'' اولیاء اللہ، اہل اللہ وغیرہ سے اوپر نہ لے جاؤ۔ ان الفاظ کی تاویل آسان بھی ہے اور اس سے تمہاری مسلمانی پر حرف بھی نہیں آتا ورنہ ذرا تجاوز کر جاؤ تو ہر فقیہ تمہیں مشرک ٹھہرائے گا اور خواہ مخواہ کی پریشانی مول لینی پڑے گی!

[یہ صفات صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی ہیں، جو بعض لوگوں نے اپنی نادانی اور گمراہی سے مخلوق کی طرف منسوب کر رکھی ہیں، معاذ اللہ! ---ادارہ]

ناظرین اندازہ فرمائیں کہ عقائد باطلہ وفاسدہ کی تائید وحمایت کے لیے اگر علماء سوء اس طرح کمربستہ نہ رہتے تو بھلا اسلام میں شرک بیچارا کہاں بار پا سکتا اور مسلمانوں میں اس کے اثرات اتنی کثرت ووسعت کے ساتھ کیوں رونما ہوتے!

یہ تو نمونہ ہے ان علماء کی کاوشوں کا جو کسی نہ کسی طرح شریعت کے دائرہ میں رہنا چاہتے ہیں۔ مگر ان سے کہیں زیادہ نقصان جس طبقہ نے پہنچایا ہے وہ ایسے جاہل اور خیرہ سر ''صوفیوں'' کا طبقہ ہے جنہوں نے شریعت اور ''طریقت'' کو ایک دوسرے سے الگ بلکہ متضاد قرار دے لیا ہے۔ ان کے نزدیک ''ظاہر و باطن'' کے کوچے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں اور دونوں کوچوں کے قانون بھی جدا جدا وہ دوسرے میں بالکل حرام اور ایک میں جو چیز قطعی حرام ہے وہ دوسرے میں بالکل حلال بلکہ فرض اور کار ثواب۔ چونکہ یہ طبقہ مسلمانوں ہی میں شامل رہنا چاہتا ہے، اس لیے وہ شریعت کا نام لینے اور قرآن

وحدیث کی باتیں کرنے پر بھی مجبور ہے مگر راہ فرار اتنی کشادہ ہے کہ جب اور جس طرف سے چاہے نکل بھاگے گا۔ شریعت کی پابندیوں کا ذکر کیجیے تو وہ "طریقت" میں جا پناہ لے گا۔ مگر "طریقت" بھی بہر حال ایک قانون ہے اور قانون کی بندش بہر حال اس کے ہوائے نفس پر سخت گراں ہے، اس لیے وہ وہاں سے بھی نکل بھاگے گا اور "حقیقت" تک جا پہنچے گا۔ پھر چونکہ مسلمانوں کا دینی کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے اور اس کا کلمہ سے فرار اسلام ہی سے فرار ہے، اس لیے وہ "مقام حقیقت" پر کھڑا ہو کر پکارے گا کہ لا الٰہ الا اللہ کے معانی ہیں "کچھ نہیں سوائے اللہ کے۔" جب اس کے سامنے قرآن کھول کر لے آئیے اور اس کے مزعومہ معنٰی کی تردید کر بیٹھیے تو وہ سینہ اور سفینہ کی بحث چھیڑ دے گا۔ کہے گا کہ یہ اوراق کیا لیے بیٹھے ہو۔ جو کچھ ہمارے لوح دل پر نقش ہے اور جو ہم تک "سینہ بہ سینہ" منتقل ہو کر پہنچا ہے وہ تو کچھ اور ہی ہے!

اس گروہ کی تحریریں اور تقریریں دراصل ہفوات وہزلیات کی ایک پوٹ بلکہ ایک بحران زدہ بیمار کے ہذیانات ہیں۔ قبر پرستی اور "اولیاء پرستی" کے لیے ان لوگوں نے وہ وہ طوفان اٹھائے ہیں کہ زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین بنا ڈالا۔ وہ قبر پر پیشانی رکھ دیں گے مگر کہیں گے کہ تم اندھے ہو! تم کیا جانو کہ ہم کس کو سجدہ کرتے ہیں۔ دراصل کعبہ سامنے آ گیا تھا اس لیے ہم نے فوراً اللہ تعالیٰ کے آگے اپنی جبیں رکھ دی۔ وہ "عرسوں" میں عورتوں کا ناچ دیکھیں گے اور نظارہ بازی سے لطف اندوز ہوں گے، مگر کہیں گے کہ "المجاز قنطرة الحقیقة" (مجاز حقیقت کا پل ہے) تم کو کیا خبر کہ ہم اس حسن میں کون سے حسن کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ وہ رات دن ساز کے مشغلہ میں مگن ہوں گے، مگر کہیں گے کہ ان سازوں میں ہم اللہ کی آواز سن رہے ہیں۔ وہ شراب تک پی جائیں گے مگر کہیں گے کہ یہ دراصل شراب طہور کی یاد ہے، بلکہ خود شراب طہور ہے! (جی! کیوں نہیں! دوسروں کو تو شراب طہور آخرت میں ملے گی، ان "بزرگوں" کو دنیا ہی میں دی جا چکی ہے) وہ بدکاری تک کر گزریں گے، مگر کہیں گے کہ اللہ کی مشیت کے بغیر دنیا میں پتہ تک حرکت نہیں کر سکتا!

[ایسی ہفوات وبکواسات سے اللہ تعالیٰ کی کروڑہا بار پناہ! یہ لوگ "بزرگ" کہاں ہیں! یہ تو شیطان کے چیلے ہیں---ادارہ]

ظاہر ہے کہ اس طرز کے لوگوں کی بکواس کا جواب کسی ہوشمند انسان کے بس کی بات نہیں ہے، اس لیے ہم اسے یہیں ختم کیے دیتے ہیں۔ مگر ناظرین سے ضرور عرض کریں گے کہ جب گمراہی کے آنے اور پھیلنے کے اتنے بے شمار راستے ہیں تو آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیے، اگر آپ دیکھیں کہ مسلمانوں میں مشرکانہ اعمال ورسوم کا خوب چرچا ہے اور یہ کہاں سے ہوتا آیا ہے!

ہماری اوپر کی ساری بحث صرف ''قبر پرستی'' کے رد میں ہے۔اسی لیے ہم نے اپنے مضمون کا ہر عنوان ''قبر پرستی'' قرار دیا ہے۔اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ ہم قبور اور اہل قبور کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ کرنے ہی کو ناجائز ٹھہرا رہے ہیں۔دوسرے تمام مسئلوں کی طرح نبی ﷺ نے اس مسئلہ میں بھی واضح حدود مقرر فرمائی ہیں اور خود بھی اس پر عمل کر کے دکھایا ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈال دیں۔
اچھا! اب آیئے! نبی ﷺ سے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ایک مسلمان کو قبروں اور قبر والوں سے کس قسم کا اور کتنا تعلق رکھنا چاہیے؟

فرمایا:

''میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کیا تھا۔پس اب قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ چیز دنیا سے بے رغبت کرتی اور آخرت کی یاد دلاتی ہے!''

(صحیح مسلم، کتاب الجنائز/سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث ۱۵۷۱)

اس حدیث سے تین باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ نبی ﷺ نے ابتداء میں زیارت قبور سے منع فرمایا تھا۔اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حکمت تشریع اسی کی مقتضی تھی۔ایک کام خواہ وہ بجائے خود صحیح اور مفید ہی کیوں نہ ہو، اگر اس کے ساتھ غلط اعتقادات اور غلط رسوم و رواجات کا جوڑ لگ گیا ہے تو جب تک اعتقادات کی بخوبی اصلاح نہ ہو جائے، اس سے منع کرنا چاہیے۔یہ ممنوعیت عارضی ہوتی ہے مگر ضروری بھی ہوتی ہے، کیونکہ اس روک کے بغیر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ آدمی کہیں مزید مفسدوں کا شکار نہ ہو جائے۔اور اگر یہ بات نہ بھی ہو تب بھی فساد عقیدہ کے باعث دوسرے طریقوں سے اس کی اصلاح دیر طلب ہو جایا کرتی ہے۔چونکہ عہد جاہلیت کے عرب قبر پرستی میں مبتلا تھے، اس لیے ان کے عقائد کی مکمل اصلاح تک نبی ﷺ نے قبروں کے پاس جانے سے انہیں روک دیا!

۲۔ جب نبی ﷺ نے یہ محسوس فرمایا کہ لوگوں کے ذہن و فکر کی اس حد تک اصلاح ہو چکی ہے جہاں تک انہیں اسلام پہنچانا چاہتا ہے تو پھر آپ ﷺ نے یہ عارضی روک ہٹالی اور فرمایا کہ زیارت قبور کیا کرو۔یہ اجازت بھی ہے اور حکم بھی۔کیونکہ اس سے دینی فکر کو قوت اور دینی جذبات کو حرکت ملتی ہے۔لہٰذا جو چیزیں معین مقصد و مفید مقصد ہیں، مسلمانوں کو ان سے باز نہیں رہنا چاہیے!

۳۔ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد مسلمان کی اعلیٰ صفات ہیں۔چونکہ زیارتِ قبور ان میں اس

کی مددگار ہے، اس لیے مسلمان کو اسے اختیار کرنا چاہیے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زیارت قبور میں لازماً یہی مقصد پیش نظر رہنا چاہیے۔ جن زیارتوں میں یہ مقصد سرے سے پیش نظر ہی نہیں ہوتا، وہ حدود شرع سے صریحاً متجاوز ہیں اور حسب مراتب شرک، قریب بہ شرک یا بدعت وغیرہ کی موجب ہیں!

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ اپنی والدہ صاحبہ کی قبر کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تو آپ ﷺ پر گریہ طاری ہو گیا۔ نبی ﷺ کی یہ حالت دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی رو پڑے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میں نے اپنی والدہ کی مغفرت کے لیے دعا کرنے کی اجازت چاہی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے منع فرمایا۔ پھر میں نے زیارت قبر کی اجازت چاہی تو مجھے اجازت دے دی گئی۔ لہٰذا تم لوگ قبروں پر جایا کرو کیونکہ اس سے موت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔"

(صحیح مسلم، کتاب الجنائز/ سنن نسائی، کتاب الجنائز، حدیث ۲۰۳۸/ سنن ابوداود، کتاب الجنائز، حدیث ۱۲۵۷)

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ یہ کہ بحوائے آیت کریمہ

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ﴾ (التوبہ ۹: آیت ۱۱۳)

"نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔"

کسی مشرک کے لیے دعائے مغفرت جائز نہیں۔ اگرچہ اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ بی بی آمنہ کے لیے شرک کے سوا کسی اور سبب سے دعائے مغفرت کی اجازت نہ دی گئی ہو۔ مثلاً یہ کہ ان کا انتقال نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے ہو چکا تھا، ان کے لیے دعائے مغفرت کی اجازت دی جاتی تو عہد جاہلیت میں مرنے والے تمام لوگوں کے لیے اس کی اجازت کا دروازہ کھل جاتا۔ حالانکہ ان تمام لوگوں کے کفر و ایمان کا صحیح فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ تاہم اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مشرکوں اور مجہول الحال لوگوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ نام لے کر دعائے مغفرت کرنا مسلمان کو زیب نہیں دیتا!

[یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ صاحب مضمون نے بی بی آمنہ کو مشرکہ کہا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ کی قبر کی

زیارت کرتے وقت جب نبی ﷺ نے ان کے لیے دعائے مغفرت کرنا چاہی تو اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اس سے روک دیا، جیسا کہ پیچھے گزری ہوئی حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے، واللہ اعلم سبحانہ وتعالیٰ ---ادارہ]

۲۔ یہ کہ مسلمان غیر مسلموں کی قبروں کو دیکھ کر بھی موت کو یاد کر سکتا ہے اور اسے عبرت حاصل ہو سکتی ہے۔

نبی کریم ﷺ لوگوں کو قبرستان میں جا کر پڑھنے کے لیے اس دعا کی تعلیم فرمایا کرتے تھے:

((السلام علیکم اهل الدیار من المومنین والمسلمین وانا ان شاء الله بکم للاحقون نسئل الله لنا ولکم العافیه)) (صحیح مسلم، کتاب الجنائز، حدیث ۲۲۵۵ و ۲۲۵۷)

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ زیارت قبر کے موقع پر پڑھنے کے لیے ایک خاص دعا خاص الفاظ کے ساتھ خود نبی ﷺ نے سکھائی ہے، اس لیے یہ مسنون ہے اور ہر زائر کو پڑھنی چاہیے۔ اگرچہ دعا کے الفاظ میں تھوڑا سا رد و بدل موجود ہے، لیکن سب میں زیارت قبر کے مقصد کی اصل روح جاری و ساری ہے اور اس کے پڑھنے سے زیارت کا اصل مقصد بہ درجہ کمال حاصل ہو جاتا ہے!

عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ جس رات میرے ہاں رہتے، آدھی رات کے وقت جنت البقیع میں تشریف لے جاتے اور یہ دعا فرمایا کرتے:

((السلام علیکم دار قوم مومنین واتاکم ماتوعدون غدامؤجلون وانا ان شاء الله بکم للاحقون اللهم اغفر لاهل البقیع)) (صحیح مسلم، کتاب الجنائز، حدیث ۹۷۴)

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:-

۱۔ یہ کہ نبی ﷺ زیارت قبور کی کثرت فرماتے اور کم و بیش ہر ہفتہ قصداً زیارت کے لیے جاتے۔

[یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ نبی ﷺ کا زیارت قبور کے لیے تشریف لے جانا استمداد اور طلب برکت کے لیے ہرگز نہ تھا نہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ قبروں پر طلب برکت، اکتساب فیض اور استمداد کے لیے جایا کرو۔ نبی ﷺ کا قبروں پر جانا اہل قبور کے لیے دعاء مغفرت کے لیے تھا اور اس لیے بھی کہ "موت" یاد آئے اور اپنے فانی و ہالک ہونے اللہ تعالیٰ کے حی و قیوم ہونے کا یقین پختہ تر ہو بلکہ تازہ ہوتا رہے---م۔ق]

۲۔ یہ کہ زیارت قبور کے لیے رات کا وقت اور خصوصاً وہ وقت جبکہ تمام لوگ سو چکے ہوں اور بستیوں پر سناٹا چھا گیا ہو، ایک موزوں ترین وقت ہے۔ کیونکہ اس وقت زیارت کا مقصد بہ درجہ اتم پورا ہوتا ہے اور قلب بہت زیادہ اثر قبول کرتا ہے!

اب ہم زیارت کے لیے چار قسم کے لوگوں کی قبروں کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں:

ا۔ عوام کی قبریں:

اگر چہ زیارت قبور کی جو غرض نبی ﷺ نے بتائی ہے، اس کی رو سے عوام وخواص اور مسلم وغیر مسلم سبھی کی قبریں یکساں ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ غریبوں اور عام لوگوں کی قبروں کی زیارت کر کے جو فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے وہ دوسروں کی قبروں سے کم ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہاں بے کسی و بے بسی، خستہ حالی و پریشان حالی اور فنائیت کی ایک مکمل تصویر بھی نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے اور آس پاس کوئی ایسی چیز بھی موجود نہیں ہوتی جو خیالات کو مرکوز کرنے اور توجہات کو قائم کرنے میں مانع ہوتی ہو۔ اگر یہ زیارت نبی علیہ السلام کے اپنے عمل کے مطابق رات کے سناٹے میں کی جاتی رہے تو آخرت کی فکر کرنے اور حالات بعد الموت پر توجہ دینے کی اچھی خاصی تربیت بھی ہوتی چلی جاتی ہے!

اگر آپ کو ابھی تک اس کا تجربہ نہیں ہوا تو ایک مرتبہ تجربہ کر کے دیکھ لیجیے! رات کو سوتے سے اٹھیے اور چپکے سے قریب کے کسی قبرستان میں چلے جایئے۔ آپ کو پہلا خیال یہی آئے گا کہ یہ تو شہر خموشاں ہے ہی لیکن زندہ انسانوں کی بستی بھی تھوڑی دیر کے لیے قبرستان ہی بنی ہوئی ہے۔ اسی لیے نیند کو موت کی بہن بھی کہا جاتا ہے۔ مگر یہ گھروں میں سونے والے صبح جاگیں گے اور پھر وہی زندگی کا ہنگامہ جاری ہو جائے گا جو روزانہ دن میں جاری رہتا ہے۔ لیکن قبروں کے سونے والے اس لیل ونہار کے ہنگامہ سے گزر چکے ہیں اور اپنی مدت حیات ختم کر کے اس طرح ہمیشہ کے لیے سو گئے ہیں کہ بس انہیں اسرافیل کا صور ہی جگائے گا۔

اس وقت آپ کے ذہن پر موت کی یاد اور آخرت کی فکر کے سوا کوئی اور چیز غالب نہ آ سکے گی۔ آپ مختلف قبروں کو دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ کچھ تو کچی ہیں اور کچھ بوسیدہ۔ بہت سی قبروں کا تو نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔ اور کتنی قبریں ہیں جو دوسری قبروں پر بنتی چلی گئی ہیں۔ یہ مشاہدہ آپ کے قلب میں بڑی رقت پیدا کرے گا اور اگر وہاں آپ کے دوست احباب اور اعزاء واقرباء بھی دفن ہیں تو ان میں سے ایک ایک کی یاد آپ کو تڑپائے گی اور دنیا سے بیزاری پیدا کرے گی۔

پھر آپ نبی علیہ السلام کی سکھائی ہوئی دعا پڑھیں گے تو یہ محسوس ہوگا کہ گویا آپ دنیا سے چلنے کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں۔ اگر اسی طرح زیارت کی کثرت ہو تو یہ قلبی کیفیات زیارت سے زیادہ بڑھتی چلی جائیں گی۔ آپ قبروں کے پاس نبی ﷺ کی بتائی ہوئی دعا کے ساتھ دوسری بھی پڑھ سکتے ہیں، مگر ان میں وہ روح زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے جو نبی ﷺ کے بتائے ہوئے الفاظ میں موجود ہے!

[جو موت کی یاد دلائیں اور ان کو دیکھ کر انسان کو اپنی آخرت کی زندگی بہتر بنانے کی فکر اور تڑپ پیدا ہو---ادارہ]

۲۔ سلاطین وامراء کی قبریں

سلاطین وامراء کی قبروں کی زیارت بھی کچھ کم مفید نہیں۔ اگرچہ ان لوگوں کی قبریں نہایت پختہ ہیں اور ان پر بہت بڑے قبے بنے نظر آتے ہیں، جن میں فن تعمیر کی خوبیاں اور نادر کاریاں نمایاں ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین وامراء کی ''شان وشوکت'' مرنے کے بعد قائم ہے مگر اس کے باوجود ان کی دنیوی شان وشوکت کے مقابلہ میں یہ شان وشوکت بالکل مختلف نظر آتی ہے، اس لیے دلوں پر اس کا اثر بھی بہت مختلف ہوتا ہے!

[ان کی زیارت قبور سے یہ مراد ہے کہ عبرت کی نگاہ سے انہیں دیکھا جائے۔ ان سے اعتقادات وابستہ کرنا تو کھلی گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے، آمین!---ادارہ]

[سلاطین وامراء کی قبروں پر اس نیت سے جانا کہ ان کے لیے دعائے مغفرت کی جائے اور ان کی قبروں کو دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے، یقیناً فائدہ سے خالی نہیں۔ مگر امیروں اور بادشاہوں کی قبروں پر جو اونچے گنبد، ''شاندار'' قبے اور دیدہ زیب مجر تعمیر کیے گئے ہیں، انہیں دیکھ کر زائر کو موت شاذ ونادر ہی یاد آتی ہے۔ وہ تو گنبد کی ''شان وشوکت''، دیواروں کی مینا کاری اور تابوت کے نقش ونگاری میں کھو کر رہ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تاج محل اور جہانگیر کے مقبرہ پر جا کر لوگ ''پک نک'' مناتے ہیں اور بجائے اس کے کہ موت کی یاد آئے اور دنیا کی خرافات سے بے رغبتی پیدا ہو، دنیا کی تفریحات کے جھرمٹ وہاں مہیا کیے جاتے ہیں---م۔ق]

مثلاً ایک طرف مقبروں کی عظمت وبلندی آپ کو محو حیرت کرے گی مگر دوسری طرف خود صاحب قبر کی بے بسی اور خاموشی پر آپ کو حسرت بھی ہوگی، ان کے مقبروں کی عظمت وشوکت چاہے جیسی کچھ ہو مگر قبر والوں کی عظمت وشوکت تو ختم ہو چکی ہے اور ان کا نام تو اب صرف تاریخوں میں باقی رہ گیا ہے۔ اب نہ ان کا حکم واقتدار چلتا ہے نہ کوئی خود کو ان کی رعایا تسلیم کرنے پر آمادہ ہے۔ نہ ان کی درباداریاں ہیں نہ عیش کوشیاں۔ اگر وہ نیک اور عادل تھے تو ان کی یہی صفت اس بات کے لیے کافی ہے کہ ان کا نام ادب سے لیا جائے اور دل میں ان کی عزت ومحبت پیدا ہو اور اگر وہ فاسق اور ظالم تھے تو خواہ ان کے مقبرے کتنے ہی ''عالیشان'' ہوں، ان کو کوئی شخص اچھے الفاظ میں یاد نہیں کر سکتا۔

بادشاہوں اور امیروں کے ''مزارات'' پر پہلا خیال ان کے دنیوی ٹھاٹھ باٹھ ہی کا آتا ہے۔ مگر یہ دیکھ کر دنیا کے متاع غرور ہونے کا کتنا شدید احساس پیدا ہوتا ہے کہ آج ان کے ''مزاروں'' پر کہیں کوئی صاحب ودربان نہیں پایا جاتا جو زائرین کو ادب قاعدے سکھاتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر آپ لاہور میں

جہانگیر کے مقبرہ پر جائیں تو کیا آپ کو اس کا خیال نہ آئے گا کہ دنیوی جاہ وجلال کے زمانہ میں اس کے ہاں ادب قاعدہ کی انتہا یہ تھی کہ حاضرین کو اس کے سامنے سجدہ کرنا پڑتا تھا، حتیٰ کہ اس میں ذراسی کوتاہی بھی آدمی پر مصیبت کے پہاڑ لا گراتی تھی۔

آج یہی زبردستی کے معبود ہیں کہ زمین بوس اور خاموش ہیں، اور انہیں کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ کا دربار کہاں ہے اور آپ کس حال میں ہیں؟

آپ آگرہ تشریف لے جائیں اور شاہجہاں کی قبر پر جانا ہو تو تاج محل کی خوبی و خوبصورتی کو دیکھ کر آپ چاہے جتنی حیرت اور مسرت کا اظہار کریں مگر خاک میں سونے والے کے لیے تو بہر حال حسرت کے چار آنسو ہی بہا سکیں گے۔ آپ کو معاً یہ خیال آئے گا کہ شاہجہاں نے اپنی بیوی کی محبت میں چاہے لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کر کے دنیا کی ایک بے نظیر عمارت ہی کیوں نا بنا دی ہو اور خود بھی اپنی بیوی کے پہلو میں کیوں نا سو رہا ہو، مگر دنیا کے حجلہ عیش سے اس کو آخر کیا اور کس قسم کی مناسبت ہوسکتی ہے! کیا اس وقت آپ کی دیدۂ عبرت سے دو آنسو بھی نہ ٹپک سکیں گے؟

اگر آپ خلد آباد (ضلع اورنگ آباد/ دکن) میں عالمگیر کی قبر پر جائیں تو کافی زیادہ سبق آپ یہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو دنیا میں کچھ نہ ملا ہو، اگر وہ فقیر و درویش بن کر رہیں تو یہ بڑا کمال نہیں مگر جن کو دنیا کی ہر چھوٹی بڑی نعمت ملی ہوئی ہو اور دنیا کے سارے فوائد ولذائذ ان کے قدموں میں لوٹ رہے ہوں مگر وہ ان سے بے رغبت ہوں اور فکر آخرت انہیں فقر کی دولت سے نواز دے تو وہ بڑے صاحب کمال ہیں۔

موصوف کی قبر پر ان کی زندگی کے اوراق آپ کے ذہن میں تیزی سے پلٹتے چلے جائیں گے اور آپ محسوس کریں گے کہ جس شخص کو اکبر و جہانگیر کی سلطنت سے بھی کہیں زیادہ وسیع اور بڑی سلطنت ملی ہوئی تھی اور جس کے سامنے اس کے آباؤ اجداد کے ٹھاٹھ باٹھ کے نمونے بھی موجود تھے، وہ عمر بھر فقر میں ایسا سرشار رہا کہ ''فقر او از تر جنبش پیدا ستے۔'' اس نے یہ بھی نہ چاہا کہ اس کی قبر کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو بادشاہوں اور امیروں کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے۔

[۱۳۴۱ھ میں عثمان علی خاں سابق فرمانروائے دکن نے عالمگیر کے ''مزار'' کو سنگ مرمر سے پختہ کروا دیا ہے، مگر قبر کا درمیانی حصہ کھلا چھوڑا گیا ہے اور قبر بھی اونچی نہیں بنائی گئی۔ قبر کی چار دیواری اتنی مختصر اور محدود ہے کہ پانچ سات آدمی ہی داخل ہو سکتے ہیں، اور اس چار دیواری پر چھت بھی نہیں ہے]

اگر آپ رنگون جائیں اور بہادر شاہ ظفر کی قبر پر جانا ہو جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کی قبر کا صحیح نشان تک موجود نہیں۔ اس وقت اگر آپ ذوق مرحوم اور دوسرے شعراء کے ان قصیدوں کو ذہن میں رکھ لیں جو اس کی شان میں کہے گئے ہیں اور خود اس کے دلی سے نکل کر رنگون پہنچنے اور مرنے تک کی تاریخ بھی ساتھ ساتھ یاد کر لیں تو دنیا کی بے ثباتی کا ہی نہیں، دوسرے متعدد سبق آپ حاصل کر سکتے ہیں۔

[ظفر نے کہا تھا:

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کی کچھ
ہم بیکسوں کو گور غریباں پسند ہے!

اتفاق دیکھیے کہ اس کی موت بھی اسی کی پسند کے مطابق واقع ہوئی۔ دلی میں تو سات پشت خاندان زیر زمین آباد ہے۔ کابل میں بابر، سکندرہ میں اکبر، لاہور میں جہانگیر، آگرہ میں شاہجہاں، دکن میں عالمگیر۔ یہ غریب مرا تو کہاں؟ رنگون میں۔]

قبروں پر بے شمار کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں اور آپ ان سب سے سبق لے کر وہی کچھ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جس سے آپ کی زندگی ایک مسافرانہ زندگی بن کر رہے اور دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے دل نہ لگے!

۳۔ علماء وصلحاء کی قبریں:

علماء وصلحاء دراصل قوم کے رہنما ہوتے ہیں اور انہی کی علمی و دینی خدمات سے دنیا میں اسلام کا چراغ روشن رہا ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت رہے گا۔ ان کی قبروں کی زیارت تذکرآخرت اور تصور موت کے ساتھ یہ سبق بھی دیتی ہے کہ آدمی کو آخرت کا سامان کرنے کے لیے اس دنیا میں کیا کچھ کرنا چاہیے، اور سلف صالحین نے اس سلسلہ میں کیا کچھ نمونہ چھوڑا ہے۔ اگر وہ نامعلوم الاسم ہوں تو اجمالی سبق بہر حال حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کے نام معلوم ہوں اور نام کے ساتھ ساتھ ان کے کام سے بھی آدمی کو ضروری واقفیت حاصل ہو تو یہ بہت زیادہ مفید ہے۔ اگر زائر کو ان کے ساتھ اخلاقی اور روحانی نسبت بھی حاصل ہے تو اس نسبت میں جتنی زیادہ مضبوطی اور گہرائی ہوگی اتنا ہی زیادہ یہ زیارتیں زائر کو متاثر کریں گی۔

[فاضل مقالہ نگار کی رائے صائب ہے اور قرین حق وصواب ہے۔ مدیر "فاران" کو اس سلسلہ میں صرف ایک ضروری بات کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ وہ یہ کہ آجکل "اولیاء" اور صلحاء کی قبروں پر عام طور پر لوگ نذر و نیاز دینے اور استمداد کی نیت ہی سے حاضر ہوتے ہیں۔ "عرس" کے علاوہ بعض قبروں پر دن رات میلہ سا لگا رہتا ہے، ان حالات میں جناب شیخ احمد صاحب جیسے صحیح عقیدے کے لوگ قبروں پر جاتے ہیں تو انہیں وہاں "حاضر" دیکھ کر اہل بدعت یہی سمجھتے ہیں کہ جن معتقدات اور مرادوں کو لے کر ہم "مزار

اقدس'' پر آئے ہیں اسی کام کے لیے یہ صاحب بھی آئے ہیں۔ ان دنوں ''اولیاء'' وصلحاء کی قبروں کی زیارت اگر اس ''فتنہ'' میں اضافہ کر رہی ہو تو کیا کیا جائے !!اللهم فاعتبر !---م۔ق

ہم پہلے یہ عرض کر چکے ہیں کہ دین کے احکام کی رو سے قبرستان جانے کا حکم دیا گیا ہے، ''مزاروں'' پر جانے کا حکم نہیں دیا گیا! بلکہ ''مزار'' سازی اور ''مزار پرستی'' سے تو روکا گیا ہے۔ امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے بیعت رضوان کی نسبت والے اس درخت کو کٹوا دیا تھا جس کو کچھ لوگوں نے مقدس سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے صرف اس لیے کٹوایا تھا کہ لوگوں کا یہ اعتقاد اس سے بھی آگے بڑھ کر شرک کی عظیم بیماری تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ''مزار'' تو اس سے بھی زیادہ خطرناک عقائد اور خرافات اپنے ساتھ وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے جو شخص اپنے دامن کو ہر طرح کے غلط عقاید وفکر سے بچانا چاہتا ہے، اسے بہر حال ''مزاروں'' پر جانے سے رکنا ہوگا! اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری ذمہ داری یہ بھی بنتی ہے کہ دیگر لوگوں کو بھی ''مزاروں'' کی خرافات وبدعات کی حقیقت بتائیں، اللهم وفقنا لما تحب وترضا---ادارہ]

جہاں تک اسفار زیارت کا تعلق ہے، آپ زیارت ہی کے لیے بالقصد سفر نہ کریں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ سیر وسیاحت یا اپنی دیگر ضروریات سے آدمی جہاں جہاں جاسکے وہاں چاہے تو قبروں پر بھی کبھی ہو آئے یا کبھی کبھار قرب وجوار میں چلا جائے۔ جہاں التزام واہتمام یا وقت ودولت کا بڑا صرف موجود ہو وہاں چاہے ابتداء مقصد صحیح اور نیت نیک ہی رہے مگر اس میں آہستہ آہستہ فساد عقیدہ یا فساد عمل میں مبتلا ہونے کا شدید خطرہ موجود ہے، اس لیے ایک محتاط ومتقی انسان کو احتیاط وتقویٰ ہی کے مقتضی پر عمل کرنا اور شد رحال والی حدیث کو پیش نظر رکھنا چاہیے!

قبروں پر آپ دعائے مسنونہ کے ساتھ کوئی اور دعا اللہ تعالیٰ سے مانگ سکتے ہیں۔ صاحب قبر سے یہ دعا نہ کریں کہ آپ میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں۔ بعض علماء نے اس فعل کو حد جواز میں لانے کی کوشش کی ہے، لیکن مجھے اس میں سخت کلام ہے اور میں ان علماء کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جنہوں نے اس فعل کو ''بدعت'' قرار دیا ہے کیونکہ اول تو اموات پر سلام بھیجنے کی اجازت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ ان آوازوں اور دعاؤں کو سنتے بھی ہیں، اور اس کے مطابق انہیں کچھ کرنے کی آزادی بھی نہیں دی گئی۔ عالم برزخ ہمارے لیے ''غیب کا حکم رکھتا ہے اور ہم وہیں تک جاسکتے ہیں جہاں تک نبی ﷺ کے صریح ارشادات ہمیں لے جاتے ہیں۔ اس کے آگے استنباط واجتہاد یا استدلال سے کسی چیز کا تعین ہمارے علم ویقین کے دائرہ سے باہر ہے۔ پس جب نبی ﷺ سے اس کی اجازت منقول نہیں نہ صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور ائمہ اسلام نے کبھی ایسا کیا تو ہمیں بھی اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ معاملہ بہر حال مشتبہ ہے اور بندۂ مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان کو ہر قسم کے اشتباہات سے پاک رکھے۔

دوسرے یہ کہ اموات قبر کے عذاب وثواب سے دوچار ہیں۔ اگر چہ ہمیں ہر صالح شخص کے ساتھ بلکہ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے ساتھ بھی حسن ظن رکھنا چاہیے، لیکن اگر ہم ان کے کاموں اور حالات کو پیش نظر رکھیں تب بھی ہم ظن غالب سے آگے نہیں جاسکتے۔ یقینی علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے کہ ان کی صالحیت کیا درجہ ومقام رکھتی ہے، کیونکہ وہی نیتوں کا جاننے والا اور غیب وشہادت کا عالم ہے!

[دعا صرف اللہ تعالیٰ سے ہی مانگنی چاہیے کہ یہ صرف اسی کا حق ہے اور صرف اسی کو لائق ہے۔ صرف وہی دعاؤں کو سنتا اور اپنی مرضی کے مطابق قبول کرتا ہے یا نہ چاہے تو نہیں کرتا۔ علماء سلف صالحین کی بھی رائے ہے---ادارہ]

[قبرستان میں داخل ہوتے ہوئے جو مسنون سلام کہا جاتا ہے، اس کی حیثیت ایک دعا کی ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اور دعا کو قبول کرنا یا نہ کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے---ادارہ]

کون یہ جان سکتا ہے کہ کون کس حال میں اپنی قبر کے اندر پڑا ہے؟ ہمیں بلاشک صالحین سے حسن ظن رکھنا چاہیے، مگر بہر حال ہر ایک کی صحیح حالت صرف اللہ علیم وخبیر ہی کے علم میں ہے۔ اس لیے ہمیں اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے!

اگر آپ صالحین کی ذات کو وسیلہ بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تو اس کے جواز میں سخت اختلاف ہے۔ کیونکہ اس کے معانی یہ ہوتے ہیں کہ بغیر توسل کے اللہ تعالیٰ کسی کی دعا سنتا ہی نہیں اور یہ خیال بالبداہت غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ......الخ﴾

(البقرہ ۲: آیت ۱۸۶)

''اے نبی! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں!''

۴۔ غیر مسلموں کی قبریں:

اگر غیر مسلموں کی قبروں کو دیکھنے کا اتفاقاً موقع ملے تو وہ دعا نہ پڑھی جائے جو مسلمانوں کے قبرستان میں پڑھی جاتی ہے۔ کیونکہ سلام ودعا کا یہ طریقہ صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے۔ وہاں صرف اپنی موت کو یاد کرنے اور آخرت کی طرف دھیان دینے...... پر اکتفا کرے۔ اگر غیر مسلموں کی زندگیوں میں کوئی عبرت کا پہلو موجود ہے، تو اس سے عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرے!

[فاضل مضمون نگار کے اس گرانقدر مقالہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قبروں پر ''عرس'' وغیرہ کے نام سے جو کچھ ان دنوں ہو رہا ہے، ان میں سے بعض چیزیں تو ''شرک'' کی تعریف میں داخل ہیں اور بعض خطرناک قسم کی بدعات ہیں۔ مسلمانوں کو ان سب سے قطعاً

اجتناب کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق قبروں کی زیارت دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہے، کسب فیض و برکت کے لیے نہیں ---م۔ق]

[ان کی زندگیوں سے جو عبرت حاصل کی جا سکتی ہے، یہی ہے کہ یہ لوگ کتنے بدقسمت رہے کہ ایسی زندگی گزار گئے جس کا انہیں آخرت میں کوئی فائدہ نہیں ملے گا اور ایسے اعمال کر گئے جو اللہ تعالی کے ہاں قبول نہیں ہو سکتے۔ یہ خیال آ جائے تو بڑا مبارک اور برموقع ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ اگر میں نے اللہ تعالی کے دین کے مطابق زندگی نہ گزاری تو میرا انجام بھی اچھا نہیں ہو سکتا...... وغیرہ! اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ الْعَافِیَةَ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ ---ادارہ]

مطبوعات دارُالمُسلم

- سُنّت وبِدعت کی کشمکش
- نقشِ توحید
- بِدعت کی حقیقت
- یہ کیسی دِین داری ہے؟
- محمد بن عبدالوھاب رحمہ اللہ، ایک مظلوم اور بدنام مصلح
- دہشت گردی اور جہاد فی سبیل اللہ
  قرآن وسُنّت کی نظر میں
- نجد وحجاز
- محفلِ میلاد
- اصحاب صفہ

دعوت وتبلیغِ توحید وسُنّت کی نشر واشاعت کے لیے اور شرک و جاہلیّت اور بِدعات وخرافات کومٹانے کے لیے **دارالمُسلم** کی مطبوعات خود بھی پڑھیئے اور عوام النّاس کی تربیّت واصلاح کے لیے دُوسروں کوبطور تحفہ دیجیئے، جزاکُمُ اللّٰہُ خیرًا!

زیادہ تعداد میں خریدنے پر خصوصی رعایت

برصغیر کے توحید پرست ادیب ماہر القادری رحمہ اللہ
کے قلم سے ایک اور معرکہ آرا تصنیف
نقشِ توحید
دار المسلم، لاہور

ماہر القادری رحمہ اللہ کے توحید آشنا قلم سے

سُنّت و بِدعت کی کشمکش

تالیف

ماہر القادری رحمہ اللہ

مرتب

تابش مہدی

دارُالمُسلم، لاہور

توحید کی پکار

أشهد أن لا إله إلا الله

عقیدۂ توحید دین اسلام کی جان، روح اور بنیاد اول ہے۔ دیگر عقائد و ایمانیات اسلام بھی بہت ضروری ہیں اور ان کے بغیر دعویٰ اسلام و ایمان ختم ہو جاتا ہے، لیکن توحید کا مقام ان سب سے اونچا اور مقدم ہے۔ ہر نبی نے اپنی بعثت کے بعد اپنی قوم کو دعوت دین دیتے ہوئے توحید سے ہی آغاز کیا ہے، یعنی ایک اکیلے معبود کی بندگی کرنے اور شرک سے بچنے کی دعوت دی ہے۔ توحید کی ضد شرک ہے اور دین میں توحید کا ایک خاص مقام ہے اور اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سمیت تمام انسانوں کے لیے یکساں اصول وضوابط مقرر فرمائے ہیں، مسلم ہوں یا غیر مسلم سب کو ایک ہی معیار پر رکھا ہے اور تمام بنی نوع انسان کو یہ ہدایت کی ہے کہ اگر تم نے ذرہ برابر بھی شرک کیا تو تمہارے تمام اعمال ضائع اور باطل محض ہو جائیں گے اور آخرت میں تم خسارہ ہی اٹھاؤ گے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام جیسی پاکیزہ ہستیوں کو بھی تنبیہ کی کہ ان کو بہر حال شرک سے بچنا ہوگا ورنہ ان کے بھی تمام اعمال صالحہ ضائع ہو جائیں گے (ملاحظہ کیجیے: سورۃ الانعام، آیت ۸۸)۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ ان سے تو شرک کا صدور ممکن ہی نہیں تھا، کیونکہ ان کو گمراہی سے بچانے اور حفاظت کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ خود لیتا ہے۔ دراصل یہ ہمارے سمجھنے کی باتیں ہیں کہ ہمیں بہر حال اپنے ایمان کو شرک کی غلاظت سے بچانا ہے اور خود کو توحید پر قائم رکھنا ہے! اپنے اہل وعیال، عزیز واقارب اور دیگر مسلمین کو بھی یہی دعوت دینی ہے۔ افسوس کہ نبی کریم ﷺ کی مخاطب و مدعو یہ امت جسے قرآن کریم واحادیث رسول ﷺ میں توحید پر قائم رہنے، اسے تھامنے کی مسلسل دعوت دی گئی اور شرک سے بچنے کی بار بار تنبیہ کی گئی تھی، شیطانی راستوں پر چل نکلی اور اس امت کی ایک بڑی تعداد شرک جیسے جرم عظیم میں ملوث ہو گئی، اعاذنا اللہ منہ! —— ہمیں اللہ رب العالمین سے دعا مانگتے رہنا چاہیے کہ وہ ہمیں توحید اور دین خالص پر عملی طور پر قائم اور گامزن رکھے اور ہمیں موت دے تو سلامتی ایمان کے ساتھ اور ایمان کی بہترین حالت میں موت دے، آمین ثم آمین! اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نفس کے شرک، قبوری شرک، جمہوری وحکومتی شرک الغرض ہر قسم کے شرک سے محفوظ فرمائے اور ہمیں توحید کی نعمت سے مالا مال فرمائے، آمین —— یاد رہنا چاہیے کہ مسلم چاہے کیسی شاندار ایمانی اور مسنون زندگی گزارے، لیکن اگر اس کے عقیدۂ توحید میں بگاڑ آ گیا تو گویا سب کچھ اکارت چلا گیا۔ پھر چھوٹا یا بڑا، کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوگا...... نہ نماز، نہ روزے، نہ حج، نہ زکوۃ وصدقات، اسی طرح دیگر نیک اعمال! یہ کتنا بڑا خسارہ ہے کہ اعمال کر کر کے انسان تھک جائے اور وہ اعمال قبول ہی نہ ہوں، اللّٰهم احفظنا من الشرك والكفر!

یہ کتاب توحید کی پکار ہے۔ ادیب شہیر ماہر القادری کے مشہور جریدہ ''فاران'' کے ''توحید نمبر'' میں سے توحید آشنا چند پھولوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ قرآنی آیات کے حوالہ جات لگائے گئے ہیں، احادیث کی تخریج وتصحیح کی گئی ہے اور توضیحات مزید بھی کی گئی ہیں۔

اصلاح کے لیے خود بھی مطالعہ فرمائیے اور دوسروں کو بھی دعوت دیجیے، جزاکم اللہ خیراً فی الدنیا والآخرۃ!

یہی توحید کی پکار ہے!

عبداللہ ادیب

منہج کتاب وسنت کی معیاری مطبوعات